

DAMAGE BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222842

UNIVERSAL
LIBRARY

جسٹریڈ نمبر ۱۳۱

دلگداز

ادو کا مشہور ادبی و تاریخی رسالہ

بہ مہربانی گری

مولانا مولوی محمد عبد کلیم صاحب شہر

وہ ہدایت

مولوی محمد صدیق حسن صاحب ایڈیٹر

خاکسار

محمد سراج الحق (حکیم منیر دین پٹر و پل شہر
نے

دلگداز پریس میں جھاکر لکھنؤ محلہ کٹرہ بن بیگ خان شائع کیا



دلگداز

بڑے بڑے فلسفیوں کو دعائے ہے کہ اعادہ معدوم حال ہے ایسے ایسے مستند لوگوں کا یہ قول ہے تو دست ہو گا مگر بہن تو اس کے خلاف نظر آتا ہے۔ اس دلگداز کو دیکھیے کیا اثر ملے گا
میں جب یہ پہلے پہل دنیا میں آیا ہے صرف ایک جڑ کا ایک ننھا سا خوبصورت پرچہ تھا۔ اور ایسا
وجہ و دلفریب کہ جسکی ایک نظر گزری دل و جان سے خرمیاد ہو گیا ہے اختیار ہی چاہنے لگا کہ
اسٹاک کے کلیجے میں رکھ لے۔ گو یا کسی کی نگاہ ناز تھا کہ جس پر گزری گماں ہو گیا۔ اور جسے ایک نگاہ
مستانہ سے دیکھ لیا اپنا بنالیا۔ اس حالت کو ایک ہی سال گزرا تھا کہ ششمہ کے شروع سے
ایک خزانہ دل بڑھایا گیا۔ پہلا دور گویا بچپن کا دل بچانے والا احمد تھا اور اب خزانہ شباب تھا۔
پہلی دلربائی میں اگر ایک قسم کا کھلونا پن تھا جو اپنی سطحی نمائش سے دلون کا بھالیا کرتا تو اب
اس میں ایک پُر اثر متانت پیدا ہوئی جو سنجیدہ اور متین لوگوں کو اپنا فریضہ کر لیتی۔

چند سال بعد ایک خزانہ تاریخ کا اور بڑھایا گیا جس نے اسمین پختہ مغزی کا جوہر سپرد کیا۔
اسکے چند روز بعد اس میں لائف کا ایک جز اور اضافہ کیا گیا۔ اور اب یہ ساڑھے تین خزانے بنی
صنفون کا ایک متین و معقول رسالہ تھا جس میں ہر مذاق کی باتیں تھیں اور ہر رنگ کی دلفریلیں۔

پار سال جب کہ یہ سات آٹھ مہینوں تک سرزمینِ دکن سے شائع ہو چکا تھا یہ خیال
کر کے کہ اس وقت تک اسے جتنی ترقیاں حاصل ہوئی ہیں یا روحانی قسم کی تھیں اور یا کثرت مضامین
سے علاقہ رکھتی تھیں اب اسے سمائی ترقی بھی دیکھ لے۔ ارادہ کیا گیا کہ اسکا پیمانہ ۱۸ x ۲۲ سے
بڑھا کے ۲۲ x ۲۶ کر دیا جائے۔ اور مسطر گھرے مذاق والے قدر دانان سخن کے مطابق صرف ۲۱
سطر دکھا جائے۔ یہ ارادہ عمل میں آجائے تو شاید اس کی کوئی ادبی ہی وضع و صورت ہوتی مگر ایسا
تغیر و تبدل خدا کو منظور نہ تھا۔ بمصدق اسکے کہ ارادۃ اللہ غالب علی ارادۃ الناس۔ ایسی

[illegible]

ترقی کی نوبت نہ آئی اور ہم ایسے انکار و تردید میں رہے کہ ایک برس تک اس کی اشاعت ہی ملتوی پڑی رہی۔ یہاں تک کہ خدا نے اس انتظام کو بالکل پلٹ دیا۔

اب ایسی مجبوریاں پیش آئیں کہ میں پھر اپنے اصلی مرکز لکھنؤ میں واپس آنا پڑا۔ اور قدرت نے اس معشوق دلربا یا اس ہونہار پرچہ کو پھر اُسی گہوارے میں ڈال دیا جس میں اپنے عہد طفولیت میں پرورش پائی تھی جس کے جھونکوں سے کبھی یہ ہنسی خوشی کے ساتھ کھیلتا۔ اور کلکاریاں مارتا نظر آتا تھا۔ اور کبھی بچپن کی میٹھی نیند میں غافل سو جاتا۔

گو اسی سرزمین میں وہ پہلے گر کر اُٹھا۔ چوٹیں کھا کھا کے بچا۔ اور ٹھوکرین کھا کھا کے سنبھلا تھا۔ اور اسی میں کھیل کود کے بڑا ہو گیا تھا۔ یہیں اس سے بچپن کی مزہ دار مسیختگیاں ظاہر ہوئی تھیں۔ اور یہیں اس نے جوانی کی شوریدگیوں کا لطف اٹھایا تھا مگر اب کی جو قدرت نے اسے اُسی پہلے گہوارے میں ڈالا ہے تو وہی پہلا سا بچہ بنا کے۔ تاکہ نئی زندگی کے مزہ لے۔ اور نئے پرورش پاکے بڑا ہو۔ اور دنیا کو پھر وہی آغا عمر کے کرشمے دکھا دے جو پہلے دکھا چکا ہے جن کا عالم جب کبھی لوگوں کو یاد آ جاتا ہے دل ہی دل میں مزہ لے لیا کرتے ہیں اور بے اختیار زبان سے کہہ اُٹھتے ہیں کہ اب کا دگداز وہ نہیں جو پہلے تھا۔ مگر آئیے دیکھیے اور سنئے فرمے لو ٹیٹے کہ پھر وہی پرانا دگداز آپ کے سامنے ہے۔ وہی بچپن کی مسیختگیاں پھر نمایاں ہیں۔ اور ۱۹۱۷ء کے آغاز میں آپ کو وہی لطف حاصل ہو رہا ہے جو ۱۸۸۷ء میں حاصل ہوا کرتا تھا۔

یہ عادت معدوم نہیں تو کیا ہے؟ جو چیز دامن فنا میں غائب ہو گئی تھی پھر نظر آئی یا نہیں؟ دگداز کے قدر دانوں کی طرح خود دگداز کے بھی ورد زبان یہ دعا تھی کہ غریب زلیخا بشابم رسان۔ خدا نے اُسے سن لیا۔ اور یہ معجزہ یوسفی اسے نصیب ہو گیا کہ زلیخا مصر کی طرح پھر غفوان شباب ہے۔ اور یوسف کا ساحسن نظر فریب۔ ہو نہ وہی دگداز دیکھ لیجیے جو ۱۸۸۷ء میں اپنے عہد اولین میں نظر آتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ جن لوگوں کے مشتاق کان اس کی دل بجانے والی زبان سے نادل کے پیرائے میں رنگ رنگ کی مہربانیاں اور تاریخ و لائف کے ذریعہ سے طرح طرح کی سچی کہانیاں سننے کے عادی ہو رہے ہیں اُن کو نکایت ہوگی کہ اب اس سولہ صفحہ کے پرچہ میں سوا متفرق مضامین کے اور کیا رکھا ہے۔ لیکن جب وہ یہ سنیں گے کہ ان سولہ صفحوں میں وہ لطیری کرامتیں اور ادبی معجزانیاں ہیں جنہوں نے مدون قلم سلطنت میں اپنا سکہ چلایا تھا۔ رفرش سان ادب انشا

اور قدردانان سخن جن کے ولداہ تھے۔ اور جن کا چٹکارہ آج تک زبانوں پر باقی ہے۔

رہی ناول اور تاریخی اشاعت۔ اس کی نسبت مختلف تجربوں اور آزمائشوں کے بعد اور ہر قسم کی مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ بجائے اسکے کہ دگلڈاز کے ساتھ متفرق طور پر ایک ایک جز شائع ہوتا رہے آئندہ ختم سال سے پہلے دس بارہ جز کا ایک ناول اور اتنی ہی بڑی ایک تاریخی کتاب مکمل و مرتب کر کے قدردانوں کے سامنے پیش کر دی جائے گی۔ موجودہ حالت میں اکثر احباب کو شکایت بھی ہے کہ درمیان کے کسی ایک جز کے تلف ہو جانے سے پوری کتاب ناقص اور بیکار ہو جاتی ہے۔ قطع نظر اس کے ایک جز کے پڑھ لینے سے مضمون تشنہ رہ جاتا ہے اور دل کو ایک قسم کی اچھن سی رہتی ہے۔ اس جدید انتظام اور قدامت کا رنگ از سر نو اختیار کر لینے سے یہ سب شکایتیں رفع ہو جائیں گی۔ اور ناظرین دگلڈاز کو ہماری جو کتاب ملے گی مکمل (اور دیکھپ ہوگی اور پوری ہوگی)۔

لہذا آئندہ سے دگلڈاز صرف ۱۸ + ۲۲ پیانے کے ایک جز پر نکلا کرے گا۔ اس میں صرف طریری یا تاریخی مضامین ہوں گے۔ اور قیمت حسب سابق صرف ایک روپیہ (دو سالانہ مع محصول ڈاک ہوگی۔ دوران سال میں جو ناول یا تاریخی کتابیں تیار ہوں گی ان کی قیمت مقرر کر کے بذریعہ دگلڈاز ناظرین کو فوراً بتا دی جائے گی۔ اور ان کو اختیار ہوگا کہ قیمت ارسال فرما کے یا ویلیو پی ایل بھیجنے کی اجازت دے کے طلب فرمائیں۔ قدردانان دگلڈاز میں سے جو حضرات چاہتے ہوں کہ اس قسم کی ہر کتاب بلا انتظار درخواست ان کی خدمت میں تیار ہوتے ہی بھیج دی جائے کہ وہ اگر اس قسم کی عام اجازت دیدیں گے تو ان کا اسم گرامی ایک جدا گانہ رجسٹر میں درج کر لیا جائے گا۔ اور ایک ہفتہ پیشتر ایک اطلاعی کارڈ روانہ کر کے کتاب ان کی خدمت میں دے دی۔ جی بھیج دی جائے گی۔

زمانے کے انقلابات سے جدید سبق حاصل کرنے کے لیے ہم نے قطعی ارادہ کر لیا ہے کہ اب دگلڈاز برابر استقلال سے اور وقت پر نکلتا رہے۔ اور خدا سے امید ہے کہ ہم اس ارادے کو ضرور نباہے گا۔ لہذا قدردانان دگلڈاز کو توجہ فرمائیں۔ اور اس طریقہ میں ہر قسم کی اشاعت بڑھانے میں مدد دیں۔ اب قیمت کچھ نہیں صرف (دو) سالانہ ہے۔ جو کسی کو اگر ان نہیں گذر سکتی۔ ہم اپنے دوستوں سے امید رکھتے ہیں کہ وہ دگلڈاز کی ترقی و اعانت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں گے۔

بے مزد بود و منت ہر خدمت کہ کردم یارب مباد کسرا مخدوم بے عنایت

ولد اداگان حرام نصیب کی زبان سے تو یہ فکایت ہمیشہ اور ہر جگہ سنی جاتی ہے کہ جن ناناؤں میں
مہ و شون کی یاد میں ساری دنیا سے ترک تعلق کیے بیٹھے ہیں وہی انھیں اپنے دلوں سے
بھٹلائے ہوئے ہیں۔ اور جن کے نام سے جیتے ہیں انھیں کو ان کے مرنے بجائے تک کی پروا
نہیں۔ دنیا بھر میں جس کسی سے وعدہ کیا ہے پورا کریں گے اور نہ پورا کریں گے تو اسی جگہ کو
جو اپنے چاہنے والوں سے کیا ہے عشق کے ہاتھوں میں ایسے بہت سے کشتے نظر آچکے ہیں۔ وہی
یونانیوں جن سے ہمارا برتاؤ وفا داری کا ہے۔ وہی دشمن ہیں جن کے ہم دوست بنے بیٹھے ہیں
افسوس! اہلکواروں سے وفا کی ہے امید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے۔

مگر کاش یہ مصیبت عشق و عاشقی ہی کی دنیا تک محدود رہتی۔ قیامت تو یہ ہے کہ دنیا
کو جس پہلو سے دیکھیے اور آزمائے ہی حالت نظر آنے لگی۔ سچی خدمت گزاری اور خالص وفاداری
کا پھل دنیا میں ہر شخص کو ایسا ہی ملا کیا ہے۔ حاج بن یوسف ثقفی نے آل مروان کی سلطنت کی
بنیاد مضبوط کی تھی اور آخر میں مروان ہی کے ناکارہ گزار ہاتھوں سے اُس کا خاندان پامال ہوا
بنی عباس کو ابوسلم نے سرِ خلافت پر بٹھایا تھا۔ اور بنی عباس ہی کے ہاتھ سے وہ قتل ہوا۔
اسی طرح جس شخص نے خلافت بنی فاطمہ مصر کی بنیاد ڈالی تھی وہ بنی فاطمہ ہی کی شمشیر یونانی کی
نذر ہوا۔ خلاصہ یہ کہ

کس نیا موخت علم تیر از من کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

جس طرح مشوقوں کے ہاتھوں عشاق کو تکلیف ہی پہنچتی رہی اُسی طرح دیبا کے
مخدوموں سے اُن کے سچے خادموں کو ہمیشہ ضرر ہی پہنچا۔ عموماً وفا گیشن کے ساتھ
بے رحمی و بے دردی ہی کا برتاؤ ہوا۔ اور دنیا میں جب غور سے دیکھا تو یہی نظر آیا کہ تنگی
کا دلہ بے بی مل رہا ہے۔

لیکن آخر یہ ہے کیوں؟ رخِ زیبا کے دل نے اور نظر غلط انداز کے آرزو مند

بننے میں کون سی بُرائی ہے کہ لوگ دشمن ہو جاتے ہیں۔ کسی سے وفاداری کرنا یا کسی پر احسان کرنا کون سا ناپا ہے کہ اچھے اچھون کو اُسکے صلہ میں بے وفائی اور محسن کشی ہی کرتے دیکھا۔ لوگ دولت کو اندھا بتاتے ہیں کیا دنیا بھی اُسکے ساتھ اندھی ہے؟ یہ نہیں تو پھر کیا بات ہے کہ پیغمبر جس اُمت کے خیر اندیش ہوتے ہیں اُسی کے ہاتھوں سے مارے اور ستائے جاتے ہیں۔ اور فلسفی جس قوم کی اصلاح کے رہے ہوتے ہیں اُسی کے سہام جہالت کا نشانہ بنتے ہیں! مسیح و ذکر یا کے خون کے دھبے اسی ناسپاس دنیا کے دامن میں لگے ہوئے ہیں۔ اور سقراط کا سامصلح قوم فلسفی اسی ناٹھری پر قربان ہو چکا ہے۔

او اندھی اور بے وفادار دنیا! اگر تجھے اپنے خیر اندیشوں پر ترس نہیں آتا تو نہ سی خود اپنے انجام پر توفیق کر! کیا ان بے رحمیوں کے بعد تو چین سے بیٹھ سکتی ہے؟ یا ایسے مظالم کر کے تجھے کھل جائے گا؟ ہرگز نہیں۔ تو خراب ہوگی اور نہایت ہی خراب۔ ہمیں ستاکے تو بھی ستائی جائے گی۔ اور وہی ہوگا جو کسی دل جلے نے حکم لگا دیا ہے کہ ۶

تو بھی ٹھنڈا نہ رہے دل کے جلانے والے

جن دعا بازوں کے نفرون میں آکے جن جھوٹے خوشامدیوں کی باتوں پر اعتبار کر کے تو نے اپنے سچے وفائیکش دوستوں پر ظلم کیا ہے وہ تجھے اُس انجام سے نہیں بچا سکتے جس کے ہر ظلم کے بعد نمایاں ہونا ضروری ہے۔ جن غلط و بے اصل خیالات میں پڑ کے تو نے اپنے خیر اندیشوں کو اذیت پہنچائی ہے ایک دن کھلینگے اور عالم آشکارا ہو جائے گا کہ تمہا کیا اور تو نے کیا سمجھا؟

لیکن ہم نہیں چاہتے کہ اپنی بے مہربانی کے نتیجے میں تجھے کوئی انجام بد دیکھنا پڑے۔ ہم اپنے مذہب و اعتقاد کی رو سے دنیا کے بنانے اور سنوارنے کے لیے آئے ہیں نہ بگاڑنے اور آزار پہنچانے کے لیے۔ تو چاہے ہم اپنا دشمن تصور کرے مگر ہم اب بھی تیرے دوست ہیں۔ اور تیرے لیے بھلائی ہی چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ تجھے ہمیں ستاکے اپنے خیال یا زعم باطل میں کوئی نہ کوئی مسرت ضرور حاصل ہوتی ہوگی۔ مگر ہمیں اپنے دل وفائیکش و خیر طلب کے ہاتھوں تجھے کسی تکلیف و رنج میں مبتلا دیکھ کے صدمہ ہی ہوگا۔

اخفش

عربی نحو و صرف کی کتابوں میں یہ نام کثرت سے آتا ہے۔ اور ”بزر اخفش“ (اخفش کا اکبر) ہماری زبان میں ضرب المثل ہے۔ مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایسے مشہور نام والے عالم متبحر اور ایسے عالی مرتبہ امام نحو سے ہندوستان کے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ یہ وہ بزرگان سلف ہیں جو فصاحت و بلاغت کے مستند پر ہمیشہ جلوہ افروز رہیں گے اور جن کا سکہ لٹریچر کی دنیا میں قیامت تک چلتا رہے گا۔

اخفش عربی میں چند مے کو کہتے ہیں۔ جس کی آنکھ چھوٹی ہوتی ہے۔ اور نظر خیرگی کرتی ہے۔ اسی جسمانی عیب کی وجہ سے یہ لقب پڑ گیا۔ اور اس قدر مشہور ہوا کہ اصلی نام اس کے دامن میں چھپ کے ناپ ہو گیا۔ اکمال علماء عرب میں تین بزرگوں کو یہ لقب ملا جو بہ ترتیب زمانہ اخفش اکبر۔ اخفش اوسط۔ اور اخفش اصغر کہلائے۔ وہ اخفش جن کا نام سب سے زیادہ مشہور ہے جبکہ طویل میں ایک بکرے کو زندہ گی جاوید نصیب ہو گئی۔ اور جو امام نحو سیدویہ کے معاصر تھے اخفش اوسط ہیں۔ ان کا حال ہم آئندہ بیان کریں گے۔ فی الحال اخفش اصغر کے حالات بیان کرتے ہیں جو باعتبار زمانہ ہم سے قریب تر تھے۔

یہ اخفش بھی علم نحو و صرف کے بڑے عالی پایہ امام تھے۔ ابو الحسن کینت تھی۔ اور علی بن سلیمان بن فضل نام تھا۔ تیسری صدی ہجری کے وسط میں پیدا ہوئے۔ اور اس کے آخر میں شہرت حاصل کی۔ بغداد کے مضامین میں ایک گاؤں تھا بردان جس کی خاک سے بہت سے بالکل پیدا ہوئے ہیں وہی اُن کا بھی مولد تھا۔ جب معمولی درجہ کی تحصیل علم سے فراغت ہوئی تو اُس عہد کے اساتذہ فن ادب و نحو۔ مبردا و رطلب وغیرہ کے آگے زانوئے شاگردی کیا۔ اور اُن کے فیض سے علوم ادبیہ میں تبحر حاصل کیا۔ سترہ ہجری میں جب ان کا شمار پانچ نہروں میں ہونے لگا تو عراق چھوڑ کے مصر گئے۔ انیس برس وہاں رہ کے سترہ ہجری میں شام میں واپس آئے اور شہر حلب میں اقامت گزین ہو گئے۔

اگرچہ زبان و ادبیات میں کمال رکھتے تھے۔ اور فصاحت و بلاغت میں ان کا جواب دیتا مگر شاعری سے مس نہ تھا۔ نہ خود ہی شعر کہتے تھے۔ اور نہ شعر و سخن کا ایسا شوق تھا

کہ شعر اے سلف کا زیادہ کلام یاد ہو۔ اُنھوں نے کوئی ایسی کتاب بھی نہیں چھوڑی جو انکی یادگار ہو۔ اور اس کو تاہی کا سبب غالباً اُن کا افلاس تھا۔ کیونکہ حالات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے کمال و فراغ کے زمانے اور آخر عمر میں زیادہ تر مفلسی و محنت اسی میں گذری۔

چنانچہ قیام بغداد کے زمانے میں ابو علی بن مقلہ کے پاس پڑے رہتے تھے۔ وہ انکے ساتھ بھٹوڑا بہت سلوک کروا کرتا تھا۔ مگر اس سے ان کی بسر نہ ہوسکتی تھی۔ ایک دن اُنھوں نے اُس سے کہا آپ وزیر خلافت ابو الحسن علی بن عیسیٰ کے دربار میں باریاب ہوتے ہیں۔ کبھی ان کے سامنے میرا تذکرہ کیجیے۔ اور میری تنگدستی اور فقر و فاقہ کی حالت ظاہر کر کے سفارش کیجیے کہ میرا کچھ وظیفہ مقرر کر دیں تاکہ ذرا اطمینان و فارغ البالی سے زندگی بسر کر سکوں۔ ابو علی نے ان کی خواہش کے مطابق وزیر کے دربار میں جا کے ان کی درخواست پیش کر دی۔ جسے سُن کے وزیر ابن عیسیٰ چلین بہ حسین ہوا۔ اور ابو علی کو بھرے دریا میں اس طرح چھڑکا کہ اُسے سخت صدمہ ہوا۔ اور نادم و ناکام واپس چلا آیا۔

ہم نے انھیں اصغر کی زندگی کے یہ جتنے واقعات بیان کیے ہیں سب معمولی ہیں۔ اور نہ ان میں کوئی ایسی خاص بات نظر آتی ہے جس کے باعث ان کی لائق اُردو پبلک کے سامنے پیش کی جائے۔ مگر ان میں ایک بات تھی۔ اور بہت بڑی بات تھی۔ جو آج ہی کل نہیں از منہ اُضنیہ میں بھی کسی کو کسے دے سکے۔ باکمال میں نہ نظر آئی ہوگی۔ وہ یہ کہ ان میں اور ان کے معاصر شاعر ابن رومی میں باہم اختلاف تھا۔ وہ ان کے کمال سے جلتا تھا اور یہ بھی اُس کو اچھا نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ اُس کے چھڑنے کے لیے ان کا معمول تھا کہ روز اُسکے دروازہ پر جاتے اور اُسے سنا کے کوئی ایسا بدشگونوی و بدفالی کا کلمہ کہہ دیتے کہ وہ نہایت پریشان ہوتا۔ اُس میں یہ عیب تھا کہ نہایت ہی ضعیف الاعتقاد تھا۔ اُننے اُن کے بدشگونویوں سے اُسے ظلمان ہو جاتا۔ اور ہزاروں طرح کے اداہمَل میں پیداموئے۔ دن بھر گھر میں دروازہ بند کیے بیٹھا رہتا اور مالے دہشت کے دہلیز سے باہر قدم نہ نکالتا۔ دوسرے دن ابھی وہ کپڑے ہی پہنتا ہوتا کہ یہ پھر پونج کے نیا شگوفہ چھڑ دیتے۔ خلاصہ یہ کہ اُنھوں نے اُسے اُسی کی ضعیف الاعتقادوں کی ذخیرہ میں جکڑ کے قید اور نظر بند کر دیا اور اُس پر

دنیا تنگ ہو گئی۔ آخر حبيب ابن رومی کا اور کسی طرح زور نہ چلا تو اُس نے۔ انکی ہجو کہی۔ ہجو کے اشعار
 اخفش نے سنے تو انھیں بہت پسند کیا۔ بجائے خود اذی۔ اُن اشعار کو ادبِ مسائل میں بطور سند
 پبلک کے سامنے پیش کیا۔ مگر ابن رومی کے دروازے پر سب کے روز کوئی نحوست کا کلمہ ضرور
 چلا کے کہہ دیتے تھے جھنجھلا کے اور ہجوین کہیں۔ انھوں نے اُن ہجوؤں سے اور زیادہ علمی و ادبی
 فائدہ اٹھایا۔ اور اب ان اشعار میں انھیں ایسا مزہ آنے لگا کہ اسی شوق میں ابن رومی کو زیادہ
 چھیڑنے لگے۔ کیونکہ جلتے تھے جتنا زیادہ ستاؤ لکھا اُسی قدر زیادہ جھنجھلا کے زیادہ اچھے شعر میری
 ہجو میں کہے گا۔ آخر ابن رومی کو معلوم ہوا کہ میری ہجو کے اشعار سے اخفش بجائے اس کے کہ
 دل کو چوٹ لگے اور زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور اب ایسے ہی اشعار کہلاتے تھے۔ کہ لیے ستاؤ
 ہے تو تنگ کے اور ہمارے ہجوین کہنے سے باز آگیا۔ اسکے تھوڑے ہی زمانہ کے بعد غالباً اسے
 اخفش کی چھیڑ خونیوں سے نجات مل گئی ہوگی۔

ابوالفرج معافی اور جریری اور مرزبانی جو بلند مرتبہ علما سے نحو میں گذرے ہیں اُنکے
 شاکر و رشید تھے۔ مگر انہوں نے کہ دنیا نے اُنکے جیتے جی انکی قدر نہ جانی۔ ہم ترج ان کے لاکھ
 لکھتے وقت اُنکے کمالات کا اعتراف کر رہے ہیں اور شاید یہ نہیں آخر تک اعتراف ہوتا رہے گا۔ مگر
 جب تک وہ دنیا میں رہے زمانہ اُن سے برسرِ خلافت ہی رہا۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ نہایت ہی مفلس و تنگ دست تھے یہاں تک کہ وزیرِ خلافت کے
 دربار میں تھوڑے ذلیل کے لیے سفارش کرائی اور یوں بھی کام نہ نکلا بلکہ جس نے اُنکے حق میں
 دو کلمہ خیر کہے تھے وہ عام لوگوں کے مجمع میں ذلیل کیا گیا۔ اخفش کو اسکا بے انتہا ملال ہوا کہ
 میری وجہ سے مفت میں ایک مغزِ شخص کی تذلیل ہوئی۔ صبر کر کے ظاہرِ خاموش تو ہو رہا ہے
 مگر دل زخمی تھا۔ اس غم کے ساتھ فقر و فاقہ کی تکلیف کھانے کو کچھ میسر نہ آتا تھا اور فاقے پر فاقہ
 کرتے تھے۔ ایک دن بھوک کی شدت میں مرنے ہوئے شلم کھا گئے۔ جسکے چند گھنٹہ بعد ایک بیک
 بیٹھے بیٹھے روح پرواز کر گئی۔ کسی قسم کا مرض انتقال سے پہلے نہیں محسوس ہوئے پایا تھا۔ مگر بعد
 اطباء نے تشخیص کیا کہ وہ شلمِ قلب پر چھا گئے۔ اور اُسی قلبی بیماری میں اُن کا انتقال ہوا۔
 اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ

ذیقعدہ ۵۸۳ھ میں انھوں نے دنیا کو رخصت کیا۔ بعد ازاں میں بردان کے پل کا جو
 قبرستان مشہور تھا اُس میں انھوں نے تدفین کے سہرہ کیے گئے۔

شمع وفا

یون تو عالم میں جسدِ باشمعین روشن ہیں اور ہزاروں مجلسوں کی دھما رنگ کیفیتیں اسی شمع کی روشنی میں دکھائی دیا کرتی ہیں۔ یہی شمع کسی غریب کا چراغ، بی کسی بکڑی بکڑی ہے اور یہی تاجداروں کے سرِ فلک کشیدہ مچلون میں اپنی روشنی پھیلاتی ہے۔ یہی چراغ بت خانہ ہے اور یہی شمع حرم۔ اسی کی روشنی میں لوگ سیہ کاری و دبستی میں مشغول ہوتے ہیں اور اسی نورانی پیکر کے سامنے نظر حجاب کے خداے واحد و برتر کی عبادت کی جاتی ہے۔ اسی کی مدد سے لوگ چوری کرتے ہیں۔ ڈاکے ڈالتے ہیں۔ اور اسی مشعل کی روشنی میں فیاضی و سخاوت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہی لوگوں کو گمراہی میں ڈالتی اور یہی چراغ ہدایت کا کام دیتی ہے۔ غرض دنیا میں جتنے کام ہوتے ہیں اسی اچھون کی واقف راز اور برون کی عیب پوش شمع کی آنکھوں کے ردِ رو ہوتے ہیں۔

گو جہان کی یہ سب شمعیں بجا ہے خود ایک خاص لطف اور ایک خاص کیفیت رکھتی تھیں مگر جو بات شمع وفا میں ہے کسی میں نہیں۔ اس کا نور ازلی وابدی ہے اور دونوں جہان اسی کی روشنی سے جگمگا رہے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتی تو اس عالم امکان کی صورت بھی نظر نہ آتی۔ وفا کی یہ شمع اُس نور وحدت کی یادگار ہے جس نے لفظ ”کن“ کہہ کر سارے عالم کو روشن و منور کر دیا اور سمک سے سماک تک کفر و ظلمات کا نام باقی نہ رکھا۔

یہ بہ ظاہر خاموش ہے۔ منہ سے کچھ نہیں کہتی۔ مگر اسکے دل کی آنکھ کھلی ہوئی ہے اور سننے والوں کے کانوں میں اپنی پرسوز زبان خاموش سے اپنے محامد و فضائل بھی بیان کر دیتی ہے اور ایسا کوششِ نعمت سناتی ہے جسے سن کے محبت بھرے دلوں میں و جدو بے خودی کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ اس شمع وفا پر پر دانہ و ارتقا رہنے لگتے اور اس طرح ٹوٹ کے گرتے ہیں کہ سروِ پاکِ گلشنِ ہوش نہیں رہتا۔

شمع وفا کو سب سے پہلے کس نے روشن کیا؟ اور اسکی مصفا روشنی کہاں کہاں پڑی۔ یہ دیکھنے کی بات ہے۔ اگر دیکھنا چاہتے ہو تو چشم بصیرت سے دیکھو تھیں صاف نظر آئے گا کہ سب سے پہلے اس شمع کو اُس نورِ مطلق نے روشن کیا جو جمیع کائنات کا سبب تخلیق ہے اور اس کی نورانی روشنی

کو وہاں تک پہنچایا جہاں تک نہ ہماری عقل پہنچ سکتی ہے اور نہ ہمارا وہم و گمان۔

اسلامی نبرہ آزماؤں کے فیروزوں میں یہی چمک رہی ہے اور دینی مجاہدوں کے خجروں میں اسی کی آب و تاب ہے۔ عابد شب زندہ دار اسی سے اپنا چراغ عبادت روشن کیا کرتا اور تقید جگر عاشق اسی کی بدولت اپنے دماغِ دل میں چمک پاتا ہو۔ اسی کے نور سے کفر و شرک کی ظلمتیں مٹیں اور اسی کی حرارت سے آفتابِ اسلام درخشاں و منور ہوا۔ اسی نے لوگوں کو نامہِ ہدایت بتلائی اور اسی نے انسان کو انسانِ کامل بنا دیا۔ غرض اس کی روشنی استغفارِ عالمگیر ہوتی کہ دنیا کی کوئی محفل کوئی مجلس اور کوئی جگہ ایسی باقی نہ رہی جہاں یہ جلوہ افروز نہ ہو۔ یہاں کے نہایت بخش باغوں سرسبز و شاداب مرغزاروں اور دستانِ مستانِ خرامیوں سے بننے والی ندیوں آباد زمینوں، طوفانِ خیرِ سمندر و اُور ہر طرف سے دھکے ہوئے بہاؤوں سے گزر کے اس کی نورانی کرنیں لامکان تک پہنچ گئیں اور ہونچتے ہی عرش کی لاکھون کروڑوں قندیلیں روشن کر دیں۔ روشنی سے زیادہ دلچسپ اور دلکش اس شمعِ وفا کی تاریخ ہے۔ مگر تاریخِ عالم کے کرم خوردہ و بوسیدہ اوراق پر نظر ڈالنے اور اُس کے حالات معلوم کرنے میں اتنا لطف نہیں جتنا کہ ہم اس کی زبانِ حال سے اس کی ساری سرگذشتِ مشکورہ حاصل کر سکتے ہیں۔ فی الحقیقت اُسے شمعِ وفا! اپنا حال بھی کو خوب معلوم ہے اور تو بھی اچھی طرح بتا سکتی ہے کہ تو نے دنیا کو کیسے روشن کیا اور تیری نورانیت کا جلوہ کہاں کہاں نظر آیا؟

یہ سوال کرتے ہی ہم نے خیال کی عینک لگا کر اس طرح گھور گھور کے دیکھنا شروع کیا کہ دل کی لٹاؤں شمع کی لٹاؤں سے لگا دی اور عشقِ پسندی و وفا پرستی کے کافوں کو اُس فرشتہِ محبت کی آواز پر لگا دیا جو روزانہ اُس کی روشنی کو تیز کیا کرتا ہے۔

یہ ایک دل میں ایک نور کی کھڑکی کھل گئی اور عشق کا مورخ اس شمعِ وفا کی زبان سے یہ تقریب سرگذشتِ سنانے لگا:-

”مجھے ابتداً حضرت رب الغر نے نور محمدی کی شکل میں پیدا کیا۔ نورِ احدیت سے میرے سینہ کو منور فرمایا۔ اور ایک عرصہ دراز تک عرشِ برین پر معلق و لمعہ افکن رکھا۔ اُس کے بعد جب صنایعِ بالکمال کو اپنے حسن بے زوال کا اظہار منظور ہوا تو مجھے نبی آدم کے واسطے چراغِ رہنمائی بنایا اور حضرت آدم کا دل میرے نور سے (جو اُدۃ تمام موجودات و خلاصہ جمیع کائنات ہے) معمور کر دیا۔ حضرت آدم کی پیشانی پر جلوہ افروز ہوتے ہی مجھے ایسا نظر آیا کہ میری شمعِ اعوان سے

سارا عالم بقعہ نور بن گیا ہے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ سارے ترلے میں میری روشنی پھیلے اور تمام عالم میرے نور سے ہلکا اٹھے چنانچہ ایک خطا پر حضرت آدم خلد سے نکالے گئے اور جس تنگ تاریک راستے پر پھینکے گئے اُس میں ہی نے شمع ہدایت کا کام دیا۔ اگر میری روشنی اُن کی رہنمائی نہ کرتی تو قدم قدم پر ٹھوکرین کھا کھا کے گرتے اور سنبھلے نہ سنبھل سکتے۔ الغرض میری روشنی مرتبہ برتبہ منقول ہوتی ہوئی آنحضرت صلعم روحی فداہ کے جال جہان آرا پر پرتو فگن ہوئی اور آپ کی روشن ضمیری نے مجھے جس قدر جلادی اور چمکایا وہ انظر من الشمس ہے۔ آپ نے میرے چراغ میں اخوت مودت کا تیل ڈال کر جیسی روشنی کی وہ قیامت تک بجھنے والی نہیں۔

آپ کے بعد صحابہ کرام نے میرے نور کو چار دانگ عالم میں پھیلا دیا اور دنیا کے پردے پر کوئی جگہ ایسی باقی نہ رہی جہاں میری روشنی لمحہ اظلم نہ ہو۔ میں ہی نے مشہور عاشقان عرب مجنون عامری قیس بن ذریح اور سہور کے دل میں بالترتیب لیلیٰ، لیلیٰ، اور نفیرہ کی محبت کی آگ روشن کی۔ میری ہی روشنی سے نامور عاشقان فارسی فرہاد و دراج کے دل و دماغ شیرین و شاداب بن گئے، کے عشق میں چمک اٹھے۔ میں ہی نے یوسف و زلیخا کے دل میں الفت کا شعلہ بھڑکایا اور میں ہی نے دامن و غدار کا چراغ محبت روشن کیا۔

میں ہی منصور و حلاج کے دل میں شمع ہدایت بھڑک چکی اور میری ہی گرمی عشق نے حضرت ابو بکر شبلیہ کے منہ سے جوش و خروش کے ساتھ نور مستانہ نکلوا دیا جس کی صدا و ذوق مستناس کا نون میں اب تک گونج رہی ہے اور شتر تک یونہی گونجا کرے گی۔ میں ہی نے ہیر رانجھا کے دل میں آگ لگائی۔ میری ہی وجہ سے نل و من کا سینہ جل کر کباب ہوا۔ اور میں ہی انٹونی و کلیپٹر کے دل میں شمع و فابن کر چکی۔

قری و ثمشاد کے دل میں میری ہی گرم جوشی و زندہ دلی پیدا کی ہوئی ہے۔ گل کے فراق میں بلبل میرے ہی دم سے دیوانے ہو رہے ہیں اور ہمیشہ دیوانے بنے رہیں گے۔ کلب و قری کے عشق میں میری ہی روشنی عکس فگن نظر آتی ہے اور شمع و پروانہ میری ہی آگ میں جل رہے ہیں اور صبح مشترک برابر جلتے رہیں گے۔

القصہ میرا فیض عام ہے۔ میں مومن و کافر میں وجہ امتیاز نہیں پیدا کرتی۔ اور اُن کے دلوں میں یکساں روشنی کرتی ہوں۔ ذی روح و غیر ذی روح میں کوئی فرق نہیں سمجھتی۔ اور اپنے نور کا پرتو دونوں پر ڈالتی رہتی ہوں۔ اب چاہے تم اپنی آنکھوں سے میری شعا عوں کو نہ دیکھتے ہو مگر انہی

شعور اور چراغوں کی روشنی میں چلتے پھرتے ہو جو میرے نور سے روشن ہوئے ہیں۔
 میں نے تمہیں دنیوی تمدن و معاشرت اور تہذیب کے وہ راستے دکھائے جو تمہیں کبھی خواب
 بھی نظر نہ آئے تھے۔ اور اسی پر اکتفا نہ کر کے میں نے راہ آخرت کی دور دراز گلیوں میں بھی تمہاری ہر
 کیواستے اپنی بجلی کے لیمپ روشن کر دیے تاکہ میرے نور کے اُجالے میں تم راہ نجات پا سکو اور
 اس تیرہ خاندان عسری سے محل کر اس عالم نو میں پہنچ جاؤ جہاں پہنچنے کے لیے ہر شخص
 بے چین و بے قرار ہے۔“

شیخ و فاضل زبان سے یہ حالات سننے کے بعد کون شخص ہے جو نور ایمان رکھتا ہو اور اپنے دل میں
 اس کا چراغ روشن نہ پائے؟

راقم سید نظام الدین شاہ دگلیر اکبر آبادی۔

ریو یو خاتونان ہند

مصنفہ لالہ اگھوڑ ناتھ سہائے بی۔ لے ہیڈ ماسٹر دیال سنگھ ہائی سکول لاہور

ہندوستان کے عہد انگلشیہ میں جو مختلف تحریکیں مختلف اقوام میں ہندوؤں میں آئین افسوس ہے
 کہ ان میں بڑے فتنے ورنہ کم سے کم فرق و امتیاز ضرور پایا جاتا ہے جو ہندوستان کی کم نصیبی کی
 دلیل ہے۔ البتہ برہمن سماج ایک ایسی مجلس ہے جس کے اصول کمال پے تھپی پر مبنی ہیں۔ اس
 سماج والے کبھی دوسرے مذہب سے لڑتے جھگڑتے نہیں بلکہ جس مذہب میں جو خوبیاں
 ہیں ان کے وہ معترف اور مقرر ہیں۔ راجہ رام موہن رائے بڑے بیدار مغز اور مدبرین بزرگ
 تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے مختلف اقسام میں ربط و اخلاص پیدا کرنے کے لیے اس
 سماج کی بنیاد ڈالی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس تفرقہ پسند ملک نے اس کی قدر نہ کی اور یہ سماج
 ٹھٹھہر کے رہ گئی۔ ورنہ وہ لوگ جو ملک کی ہی خواہی کا دم بھرتے ہیں ان اصول پر کار بند
 ہو کر کام کرتے تو اس سے ایسے ایسے مسیحا اور عجیب نتائج پیدا ہوتے جو ملک کی کانگریس
 اور کانٹونمنٹ باوجود سالہا سال کی کوشش کے پیدا نہیں کر سکتیں اور اگر یہی لیل و نالہ ہو
 تو شاید آئندہ بھی پیدا نہ کر سکیں۔ اس سماج کا سب سے مقبول اور پسندیدہ فعل یہ ہے کہ وہ دوسرے

خدا بہرحمہ نہیں کرتے جو انتہا درجے کی دل دکھانے والی چیز ہے۔ بلکہ اُن سے مستفید ہو چکی کوشش کرتے ہیں چنانچہ حال ہی میں اس سراج کے ایک مغز ممبر نے آنحضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات پر ایک مختصر سی کتاب کمال بے تعصبی کے ساتھ لکھی ہے۔ جس کی نظیر ہندوستان کے کسی دوسرے فرقہ میں نہیں ملتی۔ اور اُن کا یہ کام نہایت قابل قدر اور مستحسن ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہم افسوس کے ساتھ یہ دیکھتے ہیں کہ اسی سال اس سراج کے ایک ملائق ممبر نے ایک کتاب بنام حیاتِ تونان ہندو شائع کی ہے جس میں غلط واقعات کی بنا پر مسلمانوں کے ایک عظیم الشان بادشاہ پر اہتمام لگایا ہے جو بیخ و بن دینے والی بات ہو۔ تاریخ میں اگر تحقیق سے کام لیا جائے تو سچائے مفید ہونے کے مضمر ثابت ہوتی ہے۔ اور اسی لیے تاریخ کا لکھنا بڑے محقق شخص کا کام ہو ہندوستان کا یہ زمانہ ایسا نہیں ہے کہ اس میں اس قسم کی تالیفات بے سوچے سمجھے شائع کی جائیں۔ ہندو مسلمانوں کا معاملہ بہت نازک ہوتا جاتا ہے اور بجا اور ناروا حملوں کے کرنے سے باہمی مخالفت اور بڑھتی ہے جو اس بنی صیب ملک کے حق میں سم قابل کا اثر رکھتی ہے۔ اس لیے ہندو مسلمان مولفین مصنفین کا فرض ہے کہ اس کا خاص لحاظ رکھیں اور اپنی سہل انکاری اور کہتا ہی سے ملک کو خواہ مخواہ نقصان نہ پہنچائیں۔

اس کتاب میں ہندو مسلمانوں کی ۱۲ مشہور عورتوں کے حالات درج ہیں۔ از انجملہ توپنا گڑھ کی شانہزادی کا حال بھی ہے۔ جس میں شہنشاہ اورنگ زیب پر سخت حملے کیے گئے ہیں اور کوئی تاریخی ثبوت یا کسی تاریخ کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ ایسی سخت باتوں کا لکھنا اور تاریخی حوالہ نہ دینا بہت بڑی جرات کا کام ہے تحقیق کرنے سے ہمیں معلوم ہوا کہ اس کا ماخذ ٹاڈ کی کتاب راجستان ہے۔ ٹاڈ وہ شخص ہے جس نے راجپوتوں کی حمایت میں مسلمانوں پر نہایت کٹک اور دل دکھانے والے حملے کیے ہیں۔ اور اس کی کتاب جا بجا فرضی واقعات اور غلط تفصیلات و حکایات سے ملبہ ہے۔ مولف کتاب نے ان واقعات کو بلا تحقیق ہو ہو نقل کر دیا ہے۔ اور ٹاڈ کی کتاب کا بھی حوالہ نہیں دیا۔ اور سب سے بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ اس شانہزادی کے حالات تو دونوں صاحبوں نے لکھے ہیں مگر شانہزادی کا نام کسی نے بھی نہیں لکھا جو اس قدر مشتبہ بات ہے۔

نہی ہی میں مولف کتاب لکھتا ہے کہ ”تواریخ کے پڑھنے والوں سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ مغلیہ خاندان کی سلطنت اکبر جہانگیر اور شاہ جہان کے عہد میں بہت عروج پر تھی اور

اورنگ زیب کا زمانہ شروع ہوتے ہی اس زبردست سلطنت میں کھلبلی مچنی شروع ہو گئی۔ اورنگ زیب نے دیکھا کہ اُس کی سلطنت دنگانی شروع ہو گئی ہے تو اُس نے مختلف قسم کی چالیں چلانی شروع کیں۔ ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے اُس نے یہ سوچا کہ اپنے دادا کی طرح راجپوتوں سے رابطہ اتحاد پیدا کرے۔ چنانچہ اس ارادہ کو عملی شکل دینے کے لیے اُس نے اپنے قاصدوں کے ذریعہ سے کسی لائق راجپوت شاہزادی کی تلاش شروع کی۔ ہوتے ہوئے اُسے معلوم ہوا کہ روپنا گروہ کی شاہزادی نہایت حسین اور شادی کے قابل ہے۔ چنانچہ اُس کے دل میں یہ زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ جس طرح ہو سکے اُسے اپنے عقد میں لائے۔ الغرض دو ہزار سووار ایک افسر کے ماتحت روانہ کیے تاکہ وہ شاہزادی کو بااختیاط دہلی لے آئیں۔ یہیں یقین ہے کہ جس کسی نے ہندوستان کی تاریخ بغور یا سرسری طور سے بھی پڑھی ہے وہ کبھی اسے تسلیم نہ کرے گا۔ وہ مورخ جو اورنگ زیب کی پالیسی کے سخت مناعت بین انھوں نے کبھی اُس کے پرائیویٹ کیریئر کی بے انتہا تعریف کی ہے۔ جو خیال ٹاؤنٹا صاحب یا مولف کتاب نے بیان ظاہر کیا ہے اس کا پتہ کسی تاریخ سے نہیں ملتا۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”جب شاہزادی کو یہ حال معلوم ہوا تو اُس نے علانیہ یہ کہہ دیا کہ اورنگ زیب کی بیوی بننے کی نسبت میں موت کو ترجیح دوں گی اور فوراً میواڑ کے رانا راج سنگھ سے شادی کر لی۔ جب یہ حال اورنگ زیب کو معلوم ہوا تو اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور فکار کے ہاتھ سے کھلجانے پر کٹافسوس لے گا۔ آخر قہر و دیش بر جان درویش خون جگر کھا کر چُپ ہو بیٹھا اور تاک میں رہا کہ کب موقع ملے کہ رانا اور شاہزادی سے دل کھول کر بدلا لے“ قطع نظر اس کے کہ واقعات کا گلا گھونٹا گیا ہے۔ طرزِ تحریر کس قدر رکیک اور لغو ہے۔ اس کے بعد اُس خط کا ذکر کیا ہے جو رانا نے اورنگ زیب کو لکھا ہے اور جس کا صحیح ہونا اب تک پایہ ثبوت کو نہیں پہنچا ہے۔ مولف کتاب لکھتے ہیں کہ اس خط کے پہنچتے ہی ”اورنگ زیب نے مصمم ارادہ کر لیا خواہ کچھ ہی ہو رانا کو نیچا دکھا کر شاہزادی کو اپنے عقد میں لائے“ اس قسم کی رکیک اور ذلیل باتیں اورنگ زیب کی طرف منسوب کرنا انتہا درجہ کی جرأت اور دروغ گوئی ہے۔ اورنگ زیب کی پارسائی اور تقاریر تمام مورخین کا اتفاق ہے۔ اور اسپر اس قسم کا اہتمام وہی شخص لگا سکتا ہے جو تاریخ سے محض ناواقف ہے۔

پھر وہ لکھتے ہیں کہ ”اورنگ زیب نے عیش میں آکر تنگ کی تیار بیان کیں۔ شاہزادی کے اصرار

اور حوصلہ دلانے سے رانا اور اُس کی فوج لڑی اور ہارون میں پناہ لیکر شاہی فوج پر وہ غضب توڑا کہ صرف تھوڑے سے آدمی بچکر واپس گئے۔ اور رانا کو عظیم الشان فتح حاصل ہوئی۔“

اس واقعہ کے متعلق صاحب آثار الامراجو وہ بھی اورنگ زیب کا مخالف ہے لکھتا ہے کہ ”جزیرہ کی وجہ سے بعض راجپوت راجاؤں میں بیدلی پھیلی اور رانا اڈیسور نے سرکشی اختیار کی لہذا سال بست و سوم جلوس میں اُس کی گوشمالی ضرور ہوئی۔ رانا اڈیپ کو چھوڑ کر بھاگ گیا اس لیے حسین علی خان کی سرکردگی میں اُس کے تعاقب کے لیے فوج روانہ کی گئی اور جوبان محمد اعظم شاہ و سلطان بیدار بخت نامزد ہوئے۔ رانا وطن سے نکل کر آوارہ و پریشان ہو گیا اور آخر شاہنہر اوسے سے شفاعت کا ملقبی ہوا اور پرگنہ ماندل و بدہنور سرکار بادشاہی کے نذر کیے۔ شاہنہر اوسے کی سفارش سے خطاب و منصب پنہزار سوار بجال ہوئے۔“

مؤلف کتاب نے اصل واقعہ کو کس قدر رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور رات کو دن اور دن کو رات کر دکھایا ہے۔

یہی رانا راج سنگھ تھا جس کی اورنگ زیب کے دربار میں ہمیشہ عزت افزائی ہوئی اور با عظمت وغیرہ عطا ہوئے چنانچہ آثار عالمگیری کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ”سال ۱۸ جلوس میں رانا راج سنگھ کو خلعت خاصہ و جہر مرصع و فرمان عنایت عنوان کے ارسال سے مغز فرمایا۔“

اس کے بعد مصنف آثار عالمگیری اسی اطاعت کیش اور وفادار راجہ کی نسبت لکھتا ہے کہ ”سال ۲۲ جلوس میں فرمان و خلعت و سر و بیج مرصع اور بیس ہزار روپیہ ارسال کیے گئے۔“

سال ۲۴ جلوس میں محمد نعیم رانا راج سنگھ کی وفات پر اس کے بیٹے جے سنگھ کے پاس خلعت تعزیت لیکر گیا۔“

اس تاریخ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ”سال ۳۴ جلوس میں رانا راج سنگھ کے بیٹے اندرنگھ کو دو ہزار روپیہ ہزار سوار اور دوسرے بیٹے ہمار سنگھ کو ہزاری پانصد سوار کے مناصب سے مغز و مغز فرمایا۔“

جس بادشاہ کی راجہ اور اُس کے بیٹوں کے ساتھ یہ عنایتیں ہوں اُس کی نسبت ایسے بہتان باندھنا بہت ہی شرمناک بات ہے۔“

اس شاہنہر اوسے کے حالات میں یہ بھی لکھا ہے کہ ایک سال بہت سخت تھا پڑا۔ رانی نے بے مثل سہر دی اپنی رعایا کے ساتھ ظاہر کی خود گھر گھر پھر کر ادویہ و خوراک تقسیم کی

اور ایک بڑا کام یہ کیا کہ دریائے گومتی میں پشتہ باندھ کر ایک خوبصورت جھیل بنوائی۔
 ٹاڈ نے اس کا رخسہ کو رانی سے منسوب نہیں کیا بلکہ راجہ سے کیا ہے۔ یہ تالاب راج سمندر کے
 نام سے مشہور تھا۔ خود نام بتا رہا ہے کہ اس کام کا کرنے والا راج سنگھ تھا۔ لیکن ہماری سمجھ میں
 یہ نہیں آیا کہ دریائے گومتی میں پشتہ باندھنے سے میواڑ میں جھیل کیسے بن گئی۔ دریائے گومتی
 مالک پتہ میں واقع ہے اور ایک دریا اسی نام کا بنگال میں ہے۔ دریائے گومتی اُس حصہ
 زمین سے بہتا ہے جو دریائے گارو گھاگھرا کے درمیان واقع ہے۔ اس کا منبج ایک چھوٹی سی
 جھیل پھانجرتال ہے جو پہلی بھیت سے ۱۱ میل کے فاصلے پر ہے اور بانسویل کا فاصلہ
 ملے کرنے کے بعد یہ دریائے گنگا میں جا گرتا ہے۔ اس کا طول البلد ۸۰ درجہ اور عرض البلد
 ۲۹ درجہ ہے لہذا اصناف ظاہر ہے کہ یہ بیان بھی غلط ہے۔

سخت فحش کی بات ہے کہ ایک ایسی کتاب جو ملک کے لڑکوں اور نوجوانوں کے
 ہاتھ میں جائے گی اس قسم کے بے سرو پا اور غلط واقعات اور سیانات سے ملوے۔
 ہمارے ہموطن بھائیوں کو ایسے محاطات میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ خصوصاً
 جب واقعات اس طرح کے ہوں کہ ان سے کسی دوسرے فرقہ کی دل آزاری کا اندیشہ ہو تو
 خاص طور پر تحقیقات اور بے تعصبی سے کام لینا چاہیے۔ ہمارے انہیں حرکات سے
 ملک کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جاتی ہے اور جب تک ہم تعصب اور تنگدلی کو نہ چھوڑینگے
 اُس وقت تک کوئی ترمیم خواہ دیکھیں ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو ملک کے لیے مفید نہیں ہو سکتی۔
 عبدالحق۔ انجیر آباد دکن۔

مریان دگلدار

آپ کی جنایت و محبت کے سہارے پر آپ کا یہ پسندیدہ پرچہ جاری کر دیا گیا۔
 اور اُسی شان سے جو شروع شروع میں اس پکچر پرچہ کی تھی۔ اب قیمت بھی صرف
 چھپے۔ کوئی دشواہی نہیں کہ آپ اپنے کل احباب کو اس کا خریدار بنا دیں۔
 سال میں ایک روپیہ ایسے اعلیٰ درجے کے لٹریچر کے لیے کسی طرح گران نہیں۔
 منیر دگلدار۔

لندن اور لکھنؤ کے مشرقی و مغربی حصہ

اس عصر کے باہل اور دولت برطانیہ کے دارالسلطنت شہر لندن کے مشرقی و
مغربی حصوں کو ایک خاص حیثیت سے شہرت و ناموری حاصل ہے۔ کیونکہ یہ دونوں
حصہ ایک دوسرے کے مقابل میں عجیب قسم کا اختلاف امتیاز رکھتے ہیں۔ مغربی حصہ
لندن دولت مندی اور شان و شوکت کا مرکز ہے۔ بڑے بڑے امرا۔ اعلیٰ درجہ
کے مدبران سلطنت۔ اور دولت مند تاجر اسی حصہ میں رہتے ہیں۔ مشہور زمانہ تعمیر
عالمی شان ہوٹل۔ اور ایلس کورٹ اور ایلیمیا کی سی تفرج گاہیں سب اسی مغربی شان
شوکت کے آغوش میں نظر آتی ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے کلب۔ جادو نگاہ درباؤں اور مہوش
خاتونوں کی عشرت گاہیں۔ عالی مرتبہ لارڈوں اور مغزوڈیو کون کی باشان و شوکت
مضلیں۔ اور علما و فضلا کی نکھری صحبتیں سب شہر کے اسی سواد میں ہیں جو نمونہ فردوس ہیں
بنا ہوا ہے۔ یہیں وہ با عظمت و جبروت عمارتیں قائم ہیں جنکی دنیا میں شہرت ہے۔ اور یہیں
کی انجمنوں اور دعوتوں میں وہ ضعیف و بلیغ سچچین سنی جاتی ہیں جو دتوں تک اطراف عالم
میں گونجتی رہتی ہیں۔ پارلیمنٹ کی اجوبہ روزگار عمارت یہیں ہے۔ ایوان خسروی و
تہجد شہریاری یہیں ہے۔ برٹش میوزیم مینیکل میوزیم۔ اور نچرل ہسٹری میوزیم یہیں ہیں۔
دفاتر سرکاری۔ اعلیٰ عدالتیں۔ وکٹ مسٹر ایچی۔ اور نیٹ پالس کنٹریڈرل
یہیں ہیں۔ اور ہانڈ پارک۔ اور رینٹ پارک کی سی فرحت بخش دجا نفر از بہت گاہیں
بھی یہیں ہیں۔ یہی حصہ فیشن کا سانچہ ہے یہیں کے درزی لباس میں روز ایک نیا بائیں
پیدا کرنے کے بادشاہ ہیں۔ یہی کی بلیمن اور خاتونین دن۔ یہاں سب دھچن نکالتی اور
بہتر نقطہ بوضع دیگر ان یار برآمد کی مصداق بنی رہتی ہیں۔ یہیں ہر موسم
دلون میں نئی انگلیں پیدا کرتا ہے یہیں روز نئی دھچن ایجاد ہوتی ہیں۔ یہیں کی ترش

خراش پر ساری دنیا کی نظر رہتی ہے۔ اور اسی کی نظر کون پر کچھ پھر کے نوجوان عیاشی و عشرت پرستی کے نئے نئے کرشمے دیکھتے سیکھتے اور فیشن ایبل بنتے ہیں۔

یہ تو لندن کا مغربی حصہ تھا۔ اب مشرقی حصہ کو بھی ادیکھ لیجئے جو غربت و فلاکت اور تباہی و خستہ حالی کا سب سے زیادہ عبرت ناک نمونہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہ حصہ لندن و خست ناک جماعتوں اور خوفناک بے حمیتوں کا ظلمت کدہ بنا ہوا ہے۔ غربت و افلاس نے یہاں تہذیب و شرافت کے ساتھ عصمت و غیرت کو بھی پامال کر ڈالا ہے۔ بہت کم ایسی رٹرکین ہیں جن میں کسی مہذب و شائستہ آدمی کو دلچسپی ہو سکے۔ اور بعض بڑے بڑے پر تو بدتمیزی و بے شرمی اور جہالت و تنگدستی ایسی مہبت ناک صورت میں رہتی ہیں کہ مہذب و شریف آدمی عزت و آبرو کے اندیشہ سے گزرتین سلکنا بڑی بڑی مصنفوں اور اعلیٰ مرتبہ کے جادو نگاروں نے اس حصہ شہر کی تباہیوں اور مصیبتوں کو عبرت ناک الفاظ اور مؤثر عبارتوں میں ظاہر کیا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ افلاس و فاقہ زدگی نے یہاں نہ عصمت ہی باقی رکھی ہے اور نہ شرافت۔ ڈاک یارڈ اور بڑے بڑے کارخانہ اس حصہ میں قائم ہیں جسے غریب مزدوروں کی بہت کچھ پرورش ہو جاتی ہے۔ مگر پھر بھی گنجان آبادی کے غریب بے سوا لون کو اکثر کو نہ پیٹ بھر روٹی ملتی ہے۔ اور نہ بقدر ضرورت کپڑا۔ جس کی وجہ سے اعتمادِ جہ کی بدکاری و بے شرمی۔ اور حد سے زیادہ بے حیائی و عصمت فروشی کے کرشمے نظر آتے رہتے ہیں۔

اس امتیاز نے یہ فرق پیدا کر دیا ہے۔ کہ مغربی حصہ کی دکانوں میں اگر اعلیٰ قسم کا مال نہایت گران قیمت پر ملتا ہے۔ تو مشرقی حصہ میں ذلیل سے ذلیل اور خراب سہی خراب چیزیں بہت ہی سستی فروخت ہوتی ہیں۔ اور اس پر مشرقی لندن کے غریب بدتمیز کر سکتے۔ لیکن اس غربت و فلاکت پر بھی مشرقی لندن اعلیٰ درجہ کی عمارتوں اور بڑے بڑے مکانات سے بھرا ہوا ہے۔ جو سلسلہ وار بڑے بڑے سربراہ فلک پہاڑوں کی طرح قائم ہیں۔ اور ان کے بھٹوں اور کھوون یعنی تنگ و تاریک حجروں اور تہ خانوں میں ہزار ہا مخلوق رات کو اس طرح بہائم کے مثل بھر دی جاتی ہے کہ نہ باپ بیٹی کا امتیاز باقی رہنے پاتا ہے نہ بھائی بہن کا۔

اب مغرب زمین کو چھوڑ کے ارض مشرق میں آئیے اور ہمارے مرحوم شہر لکھنؤ

پڑا ایک نظر ڈالیے۔ اس شہر کے مشرقی و مغربی حصوں میں بھی وہی تقابل تضاد نظر آئے گا جو لندن میں نظر آیا تھا۔ مگر فرق اتنا ہے کہ لندن کا مغربی حصہ شان و شوکت دولت و امارت اور شائستگی و تہذیب کا نمونہ ہے اور لکھنؤ کا مشرقی حصہ جس کی عمارت و آبادی سے مراد الحالی اور رونق کے ثبوت ملتے ہیں۔ اسی کے مقابل لندن کا مشرقی حصہ اگر فلاکت و افلاس کا ظلمت کدہ ہے تو لکھنؤ کا مغربی حصہ جہاں تباہی و بربادی اور فلاکت و دولت کی کوئی انتہا نہیں باقی رہی۔

یورپ والے مشرق کو عیش و عشرت اور شان و شوکت کا گھر تصور کرتے ہیں اور مشرقی دنیا خصوصاً ہندوستان والوں کے خیال میں ارض مغرب ہر قسم کی ترقیوں۔ شاندار یون۔ اور دولت مند یون کی مرکز ہے۔ اس مناسبت سے لندن اور لکھنؤ کا باہمی اختلاف چندان بے محل و بے موقع نہیں۔ تاکہ مغربی سیاح کو یہاں کے مشرقی حصہ شہر میں اپنے خیال کی مشرقی دھوم دھام نظر آجایا کرے۔ اور ہندوستان کے طالب علم کو وہاں پہونچتے ہی مغربی حصہ شہر میں وہ مغربی دھوم دھام شان و شوکت اور زینت و آرائش نظر آجائے جسکے خواب دیکھتا ہوا وہ بحرہ روم کے پار ہوتا ہو۔ مگر لکھنؤ اور لندن کا مقابلہ ہی کیا۔ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک۔ سچ تو یہ ہے کہ صحیح تقابل یونین معلوم ہو سکتا کہ لندن کے ایک دو تہ حصہ کا وہیں کے ایک فلاکت زدہ حصہ سے اور لکھنؤ کے ایک آباد حصہ کا یہیں کے ایک پامال حوادث حصہ سے مقابلہ کیا جائے۔ اگر اصلی حقیقی مناسبت دیکھنی ہے تو چاہیے کہ لکھنؤ کے بارونق مشرقی حصہ کا لندن کے پُر از عیش مغربی حصہ سے اور لکھنؤ تباہ شدہ مغربی حصہ کا لندن کے افلاس زدہ مشرقی حصہ سے مقابلہ کیا جائے تاکہ وہاں کی دولت مندی کا بیان کی دولت مندی کے مقابلہ میں اور وہاں کی فلاکت کا بیان کی فلاکت کے مقابلہ میں اندازہ کیا جاسکے۔

اس میں شاید کسی کو شک نہ ہو گا کہ لندن کی شوکت و حشمت کے مقابلے میں لکھنؤ کی دولت کوئی چیز نہیں جس شہر کی عظمت و شان کا مقابلہ سارے روئے زمین کا کوئی شہر نہ کر سکتا ہو اُس کے مقابل میں لکھنؤ کا نام لینا ہی بے عقلی ہے۔ نہ لکھنؤ کو ویسی سلطنت نصیب ہو سکتی ہے۔ اور نہ ویسی لیاقت و شائستگی۔ نہ ویسی سر بہ فلک عمارتیں نصیب ہو سکتی ہیں۔ اور نہ ویسی تفرج گاہیں۔ اور اسی سے اس کا بھی اندازہ

ہو جاتا ہے کہ لندن کی دولت کے مقابلہ میں لکھنؤ کی دولت وہی نسبت رکھتی ہے جو وہ
کو عدم سے ہے۔ مگر فلاکت و تباہی میں ہمارا لکھنؤ لندن کے مشرقی حصہ سے البتہ
مقابلہ کر سکتا ہے۔ اور ایسا مقابلہ کہ ہر حال میں وہی کامیابی کی اُمید رکھتا ہے۔
واقعی یہ بات لطف سے خالی نہیں کہ اس بے مائی پر بھی لکھنؤ ایک حیثیت سے
لندن کا مقابلہ کرنے کو موجود ہے۔ اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ لندن کے مقابلہ میں لکھنؤ
کا نام ہی نہ لینا چاہیے۔ کیونکہ اگر لندن دولت مندی میں بڑھا ہوا ہے۔ تو لکھنؤ فلاکت
زدگی میں۔ ہم اگر لندن کی شان و شوکت اور وہاں کے تزک و احتشام کا مقابلہ نہیں
کر سکتے تو وہ بھی ہماری تباہی و بربادی اور نکبت و فلاکت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔
لکھنؤ کی تباہی و بربادی! کس کی زبان کو یار ہے کہ اُسے بیان کر سکے؟ اور
کس قلم میں طاقت ہے کہ اُس کا اظہار کر سکے؟ اے انگریزی زبان کے جادو نگار و!
اور اے انگلش لٹریچر کے معجز بیا نو! تم نے مشرقی لندن کی فلاکت زدگی و مفلسی
اور وہاں کی نکبت و مصیبت کو بہت زور دے کے بیان کیا ہے۔ اپنی اس جادو بیانی سے
تم نے بہت سے دلون کو زخمی کر دیا ہے۔ بہت سے کلیجوں میں ناسور ڈال دیے ہیں۔ اور
اپنے دیگر کمالات کی طرح اپنی مصیبت کو بھی تم نے دنیا میں بے مثل و نظیر ثابت کر دیا ہے۔
مگر صرف اس وجہ سے کہ تم نے لکھنؤ کی تباہی کو نہیں دیکھا۔ تم جانتے ہی نہیں کہ تباہی و بربادی
کیسی ہوتی ہے۔ اور نکبت و فلاکت کسے کہتے ہیں۔ اگر لکھنؤ کی نکبت و مصیبت کے
سین تھھاری نظر سے گزرے ہوتے تو لندن کی فلاکت دکھانے کے لیے تمھارے
قلم میں یہ زور ہی نہ باقی رہتا۔ اور تم خود سمجھ جاتے کہ یورپ کی مسکنت و فلاکت بیان میں
جو الفاظ مبالغہ شاعرانہ خیال کیے جاتے ہیں وہ لکھنؤ کے حق میں حقیقت حال ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا میں اور بھی تباہی زدہ شہر موجود ہیں۔ اور صدمہ
عظیم الشان شہر تھے جو آج خستہ و خراب اور تباہ و ویران پڑے ہوئے ہیں۔ مگر
اُن سب کی سرگذشتیں داستانِ کمن ہو چکیں۔ اور اُن کے عروج و اقبال کا تماشا
دیکھنے والے آغوشِ لحد میں لیٹ کے ایسے خاموش ہو گئے کہ قیامت تک شکایت
نہ کریں گے۔ نہ اُن کے کھنڈروں پر کھڑے ہو کے کوئی آہ کھینچنے والا باقی رہا۔
اور نہ اُن کی تباہی کا مرثیہ سنائے والا۔ مگر لکھنؤ! آہ لکھنؤ! تیری رونق و

م عظمت شب گذشتہ ہی کی پر لطف محفل تھی جسکی یاد ہر دل میں تازہ ہے۔ اور
دیکھنے والوں کو بھلائے نہیں بھولتی۔ تیری رونق کے دیکھنے والے ہزار دن زندہ ہیں
میکڑوں آنکھیں ہیں جن کے سامنے تیرے جاہ و جلال کی تصویریں پھر ہی ہیں۔

مغربی حصہ لکھنؤ وہ لکھنؤ ہے جو گزر گیا۔ کبھی تھا اور اب نہیں ہے۔ تیرا ہی و
بربادی میں گئیں یہ ہوتا ہے کہ مکان ہیں اور مکین نہیں۔ یہاں یہ عالم ہے کہ نہ مکین ہی
رہے نہ مکان ہی رہے۔ صد ہا محلہ ہیں جن کے نام میونسپلٹی کے رجسٹر میں موجود ہیں
مگر ان میں نہ کوئی مکان رہا نہ کوئی بسنے والا۔ یہاں جو لوگ رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے
مکانوں کا آخر تک ساتھ دیا۔ جب عالیشان محلہ روٹ کی دیواریں گر گئیں تو نازنیان جرم
(باکرامن خاتونیں اور مکین) چادرین تان تان کے بسر کرنے لگیں۔ جب چھتین چھت
ہوئیں تو چھپر ڈال دیے۔ اور یہ بھی نہ نصیب ہوا تو آسمان ہی کے نیچے بسر کرنے
لگیں یہاں تک کہ فلک بے مہر یہ بھی نہ دیکھ سکا اور وہ سب ایڑیاں رگڑا رگڑا
کے اور فاقہ کر کے مر گئیں۔

لکھنؤ اتیرا مغربی حصہ ہزار ہا رزوں کا گنج شہیدان اور لاکھوں حسرتوں
اور تمنائوں کا گور غریبان ہے۔ کیسے کیسے عالیشان محل۔ اور کیسی کیسی سر بہ فلک
عمار تین آنکھوں کے دیکھتے ہی دیکھتے خاک میں مل گئیں۔ صرف دو عمارتیں ایک
نواب آصف الدولہ کا مشہور امام باڑہ اور دوسری حسین آباد کی بارونق عمارت
اس لیے باقی رہ گئی ہیں کہ اپنی گرد و پیش کی آباہی اور با شان و شوکت ایوانوں
کے کھنڈروں پر کھڑے ہوئے اور ان کی طرف اشارے کر کے ان کا مرثیہ سنائیں
اور زمانے کو مدت ہاے دراز تک یاد دلاتی رہیں۔ کہ یہاں کبھی کسی عظمت و شوکت
اور کس درجہ کی دھوم دھام تھی۔ اس پاس کے محلوں میں کیسی چیل پہل رہتی تھی۔
اور گلی کوچوں میں کیسی بھیر پین لگی رہتی تھیں۔

لکھنؤ میں باہر کے ہزار ہا سیاح آتے۔ اور آباد مشہر تی حصہ کی سیر کر کے چلے
جاتے ہیں۔ انھیں خبر بھی نہیں ہونے پاتی کہ اسی شہر کے مغربی حلقہ میں کیا قیامت
ہوا ہو گئی۔ اور کس طرح بڑے بڑے محلوں کی جگہ جن میں بھی دولت و حشمت کے بہترین
نمونے نظر آتے تھے بل جل رہا ہے۔ جد ہر دیکھے ایک عالم ہو۔ ہے۔ اور ہر طرف

موت کا سناٹا طاری ہے۔ کاش کوئی سیاح دو قدم چل کے ادھر آتا اور اس ادبار نصیبی کے سین کو بھی دیکھتا۔ اور کسی دیرینہ سال فلاکت زدہ شخص سے جس نے ان کھنڈروں سے مرتے دم تک نباہنے کا وعدہ کر لیا ہو۔ اور یہیں کی گری ٹری انیوں پر بیٹھا ہوا عبرت روزگار کا تاشاد دیکھا کرتا ہو یہاں کی سرگذشت سنا تو اسے معلوم ہوتا کہ اس قتل آرزو میں کیسے کیسے مکان کھدے۔ اور کیسے کیسے پُر خفا چمن اُجڑ گئے ہیں۔

مشرقی لندن میں افلاس ہے۔ مگر ایسا افلاس جبکہ انسان برداشت کر سکتا ہے۔ جو لوگوں کو تنگدست بناتا ہے مگر مارتا نہیں۔ آبادی کو نگہت میں مبتلا کرتا ہے مگر اُجارتا نہیں۔ لیکن مغربی لکھنؤ کا افلاس وہ افلاس ہے جو اپنے مطلوبہ مون کو روک دیتا اور پامال کر ڈالتا ہے۔ جس کو سبنا انسانی قوت سے باہر ہے۔ اور جو چند ہی روز میں غارتوں کی اینٹ سے اینٹ بجاتا۔ اور زندوں کو سو آغوش لحد کے کہیں پناہ نہیں لینے دیتا۔ مشرقی لندن کی فلاکت کے نوہ خوان انگلستان کے نازک خیال شعرا جادو بیان اسپیکر۔ اور معجز نگار ناولسٹ ہیں۔ مگر مغربی لکھنؤ کی تباہی پر کوئی رونے اور دو آنسو بہانے والا بھی نہیں۔ شعرا کو گل و بلبل کی داستان سے چھٹی نہیں۔ اسپیکر مند مسلمانوں کے مابین فرقہ اندازی کر رہے ہیں۔ اور ناولسٹ یا اسکے قصہ سناتے یا حسن و عشق کی داستانیں چھیڑتے ہیں۔

مشرقی لندن کے تباہی سے بچانے کے لیے رحم دل اور دردمند قوم سلطنت نے وہاں صد ہا کا رخانے قائم کر دیے ہیں۔ ڈاک یا رڈ ہوا دی ہے۔ جن چیزوں کی وجہ سے لاکھوں مخلوق اپنا پیٹ پال سکتی ہے۔ زمین کے نیچے ریل۔ اور اوپر ٹریوس۔ اور آسمانی بس گاڑیوں کو جاری کر دیا ہے تاکہ اس حلقہ کے رہنے والے نہایت آسانی سے آباد و پردہ دولت حصہ شہر میں پہنچ سکیں جہاں رات دن ہن برستا ہے۔ یہ خلاف اس کے مغربی لکھنؤ کی خانہ بربادی کی طرف گورنمنٹ نے بھی توجہ نہ کی۔ اور جتنے کارخانے اور کاروبار ذریعہ معیشت ہو سکتے تھے سب مشرقی حصہ شہر ہی کے لیے مخصوص تصور کیے گئے۔ متعدد ریلوے لائنوں میں سے کسی نے کوئی اسٹیشن بھی وہاں قائم نہ کیا۔ غرض ان سب چیزوں کے ذریعہ سے مشرقی

حصہ شہر ہی کی رونق و آبادی میں اضافہ کیا گیا۔
 لکھنؤ کے سب سے بڑے دوست مسٹر بلر تھے۔ جنھوں نے شہر کے گلی کو چون
 میں پھر پھر کے اور صد ہا توجہ نیکال کے شہر کی رونق دو بالا کرنے کی کوشش کی۔ مگر افسوس
 یہ بے نصیب حصہ شہر اُن کی نظر کیما اثر میں بھی قابل ہمدردی نہ ثابت ہوا۔ اُنھوں
 نے بھی اس کی طرف سے چشم پوشی کی۔ میونسپلٹی کے ممبروں سے کچھ امید
 ہو سکتی تھی مگر اُن کو بھی اُن آباد محلوں کے سوا جن میں اُن کی عالیشان کوٹھیاں
 واقع ہیں اس اجاڑ حصہ شہر سے کوئی ہمدردی نہیں۔
 مردم شماری کی رپورٹیں بتا رہی ہیں کہ مغربی لکھنؤ کی آبادی اس قدر گھٹتی
 جاتی ہے کہ ہر دس سال بعد سو میں پچیس آدمی بھی نہیں باقی رہتے۔ اور اب اس درجہ کو
 پہنچ گئی ہے کہ اُسندہ مردم شماری میں شاید وہی چار آدمی باقی رہ جائیں گے مگر اسکی
 طرف نہ گورنمنٹ ہی کو توجہ ہے۔ اور نہ اُن باختیار اراکین شہر کو جو کچھ کر سکتے
 ہیں۔ بہر حال اسے تباہ و ویران مغربی لکھنؤ تباہی و بربادی میں کوئی شہر تیرا مقابلہ
 نہیں کر سکتا اور تیری تباہی وہ تباہی ہے جس سے بچانے کے لیے کسی کو تجھ سے ہمدردی
 بھی نہیں۔ بہر حال بس ایک خدا کی ذات ہے جس سے اُسید کی جاسکتی ہے۔ مگر ظاہر
 وہ بھی تجھ پر مہربان نہیں نظر آتا۔

اردو لٹریچر

انگریزی دانوں یا اُن لوگوں کو جو آج کل کی اصطلاح میں تعلیم یافتہ تسلیم کیے
 جاتے ہیں اپنی مادری زبان اُردو کے متعلق سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ بہت ہی
 محدود زبان ہے۔ اور نازک خیالات یا اعلیٰ مضامین اُس میں نہیں ادا کیے جاسکتے اور
 انشاء پر داز جیسے کمالات اور حبیبی خوبیاں انگریزی یا دیگر زبانوں میں پیدا
 کر سکتی ہے۔ اُردو میں نہیں پیدا کر سکتی۔
 حقیقت یہ ہے کہ اُردو بآد و دوران ترقیوں کے جو اسے اگلے اور پچھلے دوروں

میں حاصل ہوتی رہیں نہایت ہی بد نصیب زبان ہے۔ پچاس سال پہلے جب ہندوستان میں عربی و فارسی کا دور دورہ تھا خود اردو بولنے والوں اور صاحب علم اہل زبان کا یہ خیال تھا کہ عربی و فارسی کے سامنے اردو کوئی وقعت نہیں رکھتی فصاحت و بلاغت کا سرچشمہ عربی ہے۔ اور اُس سے تھوڑا بہت فیض قابلیت اگر کسی زبان کو حاصل ہوا ہے تو وہ فارسی ہے جس کے لٹریچر میں غیر معمولی شیریں زبانی اور جس کی نظموں میں بہت ہی اعلیٰ درجہ کی نازک خیالی و بلند پردازی موجود ہے۔ غرض اُن کے مذاق میں جو کچھ خوبیاں تھیں عربی و فارسی کے لٹریچر میں تھیں۔ اردو کوئی چیز نہ تھی۔

اب عربی و فارسی مذاق کے ختم ہونے کے بعد جب انگریزی کا دور شروع ہوا۔ اور ہمارے تعلیم یافتہ مغربی مذاق سخن سے آشنا ہوئے تو انھوں نے عربی و فارسی کو تو یہ کہہ کے خارج از بحث کر دیا کہ ہم اُن زبانوں سے واقف نہیں۔ مگر یہ فحش "مادہ برضو ضعیف ہے" یہ "اُن کی اعلیٰ تعلیم اور مسلم الثبوت قابلیت کا سارا بازاری غریب اردو ہی پر پڑنا شروع ہوا۔ اور ہر طرف سے یہ صدا بلند ہوئی کہ اردو نہایت ہی ناقص زبان ہے۔ اس میں نہ انگریزی کی سی فصاحت و بلاغت ہے۔ اور نہ مغربی مذاق سخن کی سی دل فرمائی۔

خدا عہد یہ کہ یہ نصیب اُدو جس طرح پہلے دو میں بدنام تھی اُسی طرح اس دور میں بھی بدنام ہے۔ جیسے اگلے دنوں عہد شاعرانہ سخن سنج پیدا ہو جانے۔ مگر گھر شاعرانہ کی گرم بازاری ہونے۔ میر۔ سودا اور غالب و ذوق کے ایسے پیغمبران سخن کے غزل سرائی کرنے۔ اور سرد کے ایسے جادو بیان نثار کے داد فصاحت دینے پر بھی اردو کوئی عمدہ اور قابل توجہ زبان نہ سمجھی گئی۔ ویسے ہی اب باوجود اس کے کہ دولت برطانیہ کی توجہ سے اردو عدالت پر حکومت کر رہی ہے۔ تمام ملکی مراسلت اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ اردو میں جاری ہے۔ آزاد مولوی تندر احمد اور سر کے سے جادو بیان نثار۔ حاکمی کے سے معجز نما شاعر۔ مولوی شبلی کے سے مورخ اپنے زور قلم کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ شہر شہر اور قصبہ قصبہ میں اردو کے مدارس جاری ہیں۔ اور کوئی فن نہیں جس کے متعلق کوئی نہ کوئی کتاب اردو میں نہ شائع ہو گئی ہو۔

تعلیم یافتہ جماعت ہی کہہ رہی ہے کہ اردو کی کچھ ہستی نہیں۔ نہ اُس کی نظمیں کوئی مرزہ ہے نہ اُس کی نثر ہی میں کوئی خوبی ہے۔

انحاصل اُردو پہلے بھی مظلوم تھی اور اب بھی ہے۔ اور اُس پر ظلم کرنے والے خود وہ لوگ ہیں جو اُردو کے اہل زبان ہونے کے مدعی ہیں۔

• ہر کس از دست غیر نالہ کند سعدی از دست خوشن فریاد
لیکن اس کا سبب کیا ہے کہ اُردو پبلک کو دنیا بھر کی زبانوں میں مرزہ آتا ہے اور نہیں آتا تو خود اپنی زبان میں۔ اس راز کا پتہ لگانے کے لیے ہم نے اکثر تعلیم یافتہ دوستوں سے سوالات کیے ہیں معلوم کرنا چاہا کہ اُردوہ کون سی خوبی ہے جسے یہ لوگ اُردو میں ڈھونڈتے ہیں اور نہیں پاتے۔ ہمیں اپنے سوالوں کے جواب میں جو کچھ معلوم ہو سکا وہ اسی قدر ہے کہ بعض حضرات کو تو انگریزی سے اُردو ترجمہ کرتے وقت ویسے جامع اور صحیح مفہوم ادا کرنے والے الفاظ نہیں ملے جیسے کہ انگریزی میں تھے بعض حضرات انگریزی کو اسے اشعار اُردو میں ڈھونڈتے ہیں۔ اور وہ اُردو میں معدوم ہیں۔ اور جن چند انگریزی نظموں کے ترجمہ اُردو میں کر دیے گئے ہیں۔ اُن میں وہ انگریزی کی سی بات نہیں۔ غالباً اُسی قسم کے نقصانات عربی مذاق رکھنے والے سلف صالح کو ہون گے کہ عربی سے اُردو میں ترجمہ کیجے تو ویسے جامع و حاوی الفاظ نہیں ملتے۔ اور اُردو شاعری میں عربی شعر و سخن کی خوبیاں نہیں ہیں۔

لیکن اگر یہی اعتراضات ہیں۔ اور اس قسم کی رائیں قائم کرنے کی بنیاد اُسی قدر ہے تو میرے خیال میں اُردو زبان کو اتنی تنگ اور محدود نہیں۔ مگر خود اُن کے خیالات میں تنگی اور کج فہمی ہے۔ اور اس کا الزام بجائے اس کے کہ زبان اُردو کو دیا جائے خود اُن کی لیاقت و قابلیت پر عائد ہوتا ہے۔

دنیا کی ہر زبان کا قاعدہ ہے کہ اُس میں گرو پیش کی چیزوں۔ بوسنے والوں کی صحبتوں۔ اور اُن کے عادات۔ اطوار۔ اور معاملات کے لحاظ سے اس قسم کے خاص الفاظ ہوا کرتے ہیں جو تمام پیلوؤں اور جملہ مضامین متعلقہ کے اعتبار سے بے مثل و نظیر ہوتے ہیں اور اُن کے مماثل الفاظ جو تمام جہتوں اور کل حیثیتوں سے اُن کے مماثل ہوں دنیا کی کسی دوسری زبان میں نہیں مل سکتے۔ ایسے ہی الفاظ ہیں جن کی مناسبتوں

اور خوش ترتیبیوں سے اُس زبان کا لٹریچر بننا ہے۔ انھیں کیے ضمنی اشاروں - اور انھیں کے لوازم و تعلقات سے شاعرانہ خوبیاں پیدا ہوتی ہیں اور فصاحت و بلاغت کا جوہر نکلتا ہے۔

یونانی - لاطینی - سنسکرت - عربی - فارسی - فرانسیسی - یا انگریزی کی انھیں نہیں بہ معمولی سے معمولی زبان میں بھی اس قسم کے الفاظ کثرت سے موجود ہوتے ہیں - جن کے تناسب کبھی رعایت تفضلی کی خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں - اور کبھی رعایت معنوی کی - اور یہی وجہ ہے کہ کسی زبان کے اعلیٰ درجہ کے اشعار اور عمدہ نثر وں کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں (جیسے وہ کوئی ہو) نہیں ہو سکتا۔

موجودہ مذاق کے جو تعلیم یافتہ حضرات اردو کی بے ماگی کے اس لیے قائل ہو گئے ہوں کہ انھیں کسی انگریزی تفسیر و بلع کتاب کا ترجمہ کرتے ہیں دشوار یا ناممکن آئیں - (گوہیں اُن کی اس مصیبت سے پوری ہمدردی ہے - اور افسوس کہ اُن کی اس مشکل کو ہم دو بھی نہیں کر سکتے مگر اُن کی غلط خیالی اس طرح علاج ضرور کر سکتے ہیں کہ اگر اُن میں قابلیت ہو تو کسی بامحاورہ اور فصیح اردو عبارت کا ترجمہ انگریزی میں بھی کر کے دیکھیں - اور انصاف سے بتائیں کہ اردو زبان میں ترجمہ کرنا مشکل ہے یا انگریزی زبان میں جتنی دشواریاں اردو ترجمہ کرتے وقت پیش آیا کرتی ہیں اُن سے زیادہ یا کم (جتنی بھی) انگریزی ترجمہ کرنے میں بھی پیش آتی ہیں کہ نہیں یہ امر سب کو گمان گزرا ہے کہ وہ فلسفہ کے کسی ڈاما کا ویسا ہی باغزہ ترجمہ اردو میں باوجود متواتر گوشوں کے نہ ہو سکا - مگر اسی کی طرف کسی کا خیال نہیں گیا کہ - شبنوی تیسرے - اور شبنوی گلزار نسیم کے دو چار شعر وں - یا فسانہ عجائب کی چند سطروں کا انگریزی ترجمہ کرنے کی کبھی کسی کو جرأت بھی ہو سکی یا نہیں مگر افسوس تعلیم یافتگی کا موجودہ مذاق ایسا ہے کہ کیا عجب جو یہ بھی کوئی اردو ہی کا عجیب نہ تصور کر لیا جائے - اور صاف الفاظ میں کہہ دیا جائے کہ اردو ایسی ہیو وہ اور ناقص زبان ہے کہ اُس میں انگریزی لٹریچر کی خوبیاں نہ پیدا ہو سکتے کے علاوہ یہ بھی عجیب ہے کہ اُسکی موجودگیاں انگریزی الفاظ میں کسی طرح نہیں ادا ہو سکتیں۔

الغرض یہ جتنے اعتراضات ہو رہے ہیں - اور اردو کے جتنے عیوب بتائے جا رہے ہیں خود معترضوں کے نقصانات اور اُن کی خام خیالیاں ہیں - اور موجب طور

پر اردو کا کوئی سچا عیب نہیں بتایا جاسکتا۔ مگر ہمیں ابھی یہ معمہ حل کرنا باقی ہے کہ اگلے دنوں خود اردو کے اہل زبان غریبوں کے خیال میں اردو اس قدر حقیر کیوں تھی یا آج کل ہمارے اہل زبان انگریزی دانوں کے نزدیک وہ اس قدر بے مایہ اور ناقص کیوں ہے؟

اصل یہ ہے کہ لٹری ذوق بھی منجملہ اُن مذاقوں کے ہے جن کو انسان کوشش کر کے اپنی طبیعت میں پیدا کیا کرتا ہے۔ جیسے کہ حقہ اور تمباکو کا ذوق ہے کہ فطرۃ انسان اُس پسند نہیں کرتا۔ مگر چند روز تک اپنے آپ کو اُس کا عادی بنالینے کے بعد پھر اسے معلوم ہونے لگتا ہے کہ ان چیزوں میں کیا ذوق ہے صرف اس تمباکو پر موقوف نہیں غور کیا جائے تو انسان کے تمام ذوق اُس کے کسب و ہوا کرتے ہیں۔ اور اسی کسب و مختلف ممالک میں اختلاف مذاق پیدا کرتا ہے۔ ہر قوم اور ہر ملک کی لذیذ غذائیں۔ دماغ معطر کرنے والی خوشبوئیں۔ نظر فریب خوبصورتیاں۔ سامعہ نواز آوازیں۔ اور اسی کے ساتھ وضع قطع لباس اور سامان معاشرت کی سب چیزیں بدلی ہوتی ہیں۔ جو غذا مغرب میں لذیذ ہے۔ مشرق میں بد مزہ۔ جو عطر مشرق میں دماغ کو تازہ کر دیتا ہے اُسی کی خوشبو پر مغرب میں نالین بند کر لی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک ملک کی معشوقہ دلربا دوسرے ملک کی بد شکل اور بد قطع عورت ہے جسکے سایے سے بھی لوگ بھاگتے ہیں۔ اسی طرح ہر قوم اور ہر زبان کا لٹریچر بھی ایک نیا ذوق رکھتا ہے۔ اور وہ ذوق صرف حاصل کرنے اور پرورش کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔

اور اسی ذوق کے پیدا کرنے کے لیے ہر ملک میں پہلے خود وہاں کی مادری زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور طلبہ جب اُس میں پختگی حاصل کر لیتے ہیں تو اُن اعلیٰ درجہ کی زبانوں کی طرف متوجہ کیے جاتے ہیں جو کلاسیکل سمجھی جاتی ہیں اور علمی اور تاریخی عظمت رکھتی ہیں۔ برخلاف اس کے ہندوستان کو بدھینی سے شاید ہی کبھی وہ زمانہ نصیب ہوا ہو جبکہ انہاں کے وطن کو وہ زبان سکھائی جاتی ہو جو وہاں بولی جاتی تھی۔ شاید کبھی ہندوستان میں ایسا ہو کہ سنسکرت بولی بھی جاتی ہو اور پڑھائی بھی جاتی ہو۔ مگر خود ہندوؤں کو اس سے انکار ہے۔ اس لیے کہ اُن کے خیال میں سنسکرت دیوتاؤں کی زبان ہے۔ اور کبھی انسان کی مادری زبان نہ تھی۔ جن انگریزی

مورخین نے اُسے اریہ فاتحین کی زبان ثابت کیا ہے اگر اُن کی تحقیق مان لی جائے تو تاریخی
 عہد سے پیشتر اُس قدیم تہذیب کے زمانے میں بھی سنسکرت صرف فتح یا بون اور حاکمون کی زبانی ہوگی۔
 ہندوستان کے لوگوں کی کوئی اور زبان ہوگی جس سے نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اُس عہد میں
 بھی تعلیم سنسکرت کی ہوئی تھی۔ جو ملکی زبان نہ تھی اور جس وقت مسلمانوں نے
 ہندوستان کو فتح کیا ہے اُس وقت تو اس میں شک ہی نہیں کہ مادری زبان اور بھی
 اور تعلیمی زبان اور۔ کیونکہ سارا لٹریچر سنسکرت یا ماگدھی زبانوں میں تھا جو کہ ملکی زبانیں تھیں۔
 مسلمانوں کا عہد شروع ہونے کے بعد پہلے سے زیادہ خرابیاں پیدا ہوئیں یعنی
 ہندوؤں کی تعلیمی زبان تو سنسکرت رہی۔ اور مسلمانوں کی تعلیمی زبان بلحاظ مذہب
 عربی اور بلحاظ حکومت فارسی ہو گئی۔ مگر وہ زبان جو ملک میں بولی جاتی تھی اُسے
 تعلیم کا ہون میں ہرگز جگہ نہ مل سکی۔ یہاں تک کہ بازاری میل جول اور ہندو مسلمانوں
 کے امتزاج سے اُن دونوں زبان پیدا کی۔ لیکن تعلیم آخر تک فارسی و عربی ہی میں ہوتی رہی
 یہی کیفیت تھی کہ انگریزی عہد شروع ہوا اور فارسی کی جگہ انگریزی کی تعلیم ہونے لگی۔
 اب یہ ہوا کہ مذہبی اور قومی ضرورتوں کے لیے مسلمانوں نے فارسی اور عربی کو اور
 ہندوؤں نے ہندی و سنسکرت کو اختیار کیا۔ اور حکومت کی زبان انگریزی ہو گئی۔
 اُردو جو ملک کی مادری زبان ہے اُس کی طرف سے اب بھی بے پردائی رہی۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ برٹش گورنمنٹ نے اُردو زبان کو ممالک متحدہ
 وغیرہ کی مادری زبان تصور کر کے ہندوستان کے قدیم رواج کے خلاف سرکاری
 اور قریبی زبان بنادیا جس کی وجہ سے عام طور پر خط و کتابت اُردو میں ہونے لگی۔
 اخبارات بھی اُردو میں جاری ہوئے اور تصنیف و تالیف کے لیے بھی اُردو ہی اختیار
 کی جانے لگی۔ سرکار نے اُس کا یہ فرض دیکھ کے دیہات اور قصبات میں اُردو کی تعلیم بھی جاری
 کر دی۔ مگر اول تو وہ تعلیم اس قدر ناقص اور ناتمام درجہ تک تھی کہ اُس سے طلبہ نہیں
 کوئی لٹریچر ذوق نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف ہندو مسلمانوں میں ایسا اختلاف
 ہوا کہ ہندوؤں نے ہندی کو اپنی مادری زبان بتایا جو اگر نہ بھی تھی تو پسند و ناز کی
 کوششوں سے اُن کی مادری زبان بن گئی۔ اور اُردو صرف مسلمانوں کی زبان سمجھی جانے
 لگی۔ ان دونوں باتوں کا یہ نتیجہ ہے کہ اُردو کی تعلیم کی طرف جو عام رجحان تھا اُسے

نقصان پہنچنے لگا۔ بہر حال اُردو کی جیسی تعلیم ہوئی چاہے یہ نہیں ہوتی۔ اور اردو خوانوں میں کسی قسم کا ذوق انتشار و اڑی پیدا ہونے نہیں پاتا۔

علامہ برین جی نے اردو خوان ایک طرف انگریزی دانوں کے مقابل میں اور دوسری طرف عربی فارسی جاننے والوں کے مقابل اس قدر کم حیثیت تصور کیے جاتے ہیں کہ اُن کی رائے اُن کے خیالوں اور اُن کے مذاق کی ذرا بھی وقعت نہیں ہوتی جابلوں سے وہ کچھ یوں ہی سے ممتاز خیال کیے جاتے ہیں۔ اور ہر امر میں صاحب رائے اور صاحب اثر انگریزی دان ہی تسلیم کیے جاتے ہیں جنہوں نے ابتدا سے انتہا تک انگریزی یا عربی و فارسی لٹریچر کی باضابطہ طریقہ سے تعلیم پائی ہے۔ اور جنہوں نے اپنے دل و دماغ میں انگریزی یا عربی کے مذاق سخن کو پرورش کر کے خوب اسیر کر لیا یہ لوگ ابتدا ہی سے انگریزی اور عربی کی خوبصورت اور فصاحت و بلاغت کو محنت اور توجہ سے حاصل کرتے ہیں۔ اور جتنے علوم پڑھتے ہیں۔ اُن سب کو اُنھیں زبانوں میں سیکھتے اور درجہ کمال حاصل کرتے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ سب یا انگریزی لٹریچر کے دلدادہ ہو جاتے ہیں یا عربی لٹریچر کے اپنی مادری زبان سے رشد و بلوغ کے زمانے میں کوئی انس نہیں پیدا ہونے پاتا۔ اگر کبھی نفیض طبع کے لیے مادری زبان کی طرف توجہ بھی کرتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ اُس میں بھی اُن کو وہی لطف آئے جو انگریزی یا عربی و فارسی میں آتا تھا مگر وہ لطف نہیں حاصل ہو سکتا کیونکہ اُن کو جو لیاقت و قابلیت پیدا ہوئی ہے یا جس زبان میں اُنھوں نے لیاقت و شائستگی کو دیکھا وہ عربی ہے یا انگریزی۔ لہذا خواہ مخواہ اپنی مادری زبان یعنی اُردو ہی کو الزام دینے لگے ہیں کہ بہت ناقص زبان ہے۔ اور اس میں کسی قسم کے علمی مضامین نہیں ادا ہو سکتے۔

خلاصہ یہ کہ اُردو زبان کو جو صحیح ترقی نہیں ہوتی۔ اور خود اپنے اہل زبان کا علم میں اُسے مقبولیت نہیں حاصل ہوئی اس کا اصلی سبب یہی ہے کہ انہاں کے وطن بجاے مادری زبان کے کسی اور زبان کے لٹریچر کو خوب پرورش کر کے اپنا اصلی مذاق بنا لیا کرتے ہیں۔ یورپ میں تم جو دیکھتے ہو کہ ہر ملک اور ہر قوم کا لٹریچر روز افزون ترقی کرتا جاتا ہے اور انگریزی۔ فرانسیسی۔ جرمنی۔ اور ایتالیائی زبانوں کا لٹریچر بڑھتے بڑھتے ساری دنیا پر چھایا جاتا ہے۔ اور دنیا کی دوسری قومیں اُن کی خوبیوں کے مقابل

خود اپنی زبانوں کو بھولی جاتی ہیں۔ اس کا اصلی باعث یہی ہے کہ اُن ممالک کے باشندے پہلے خود اپنی زبان کے لٹریچر میں کمال حاصل کر لینے کے بعد دوسری زبانوں کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ وہاں بڑے بڑے لنگویسٹ (ماہرین السنہ) اور فیلسوف (مستشرقین) اور فاضل لٹریچر (علم السنہ جاننے والے) پیدا ہوتے ہیں جو تحقیق کے ساتھ دنیا کی تمام زبانوں پر اجتہادی نظر ڈالتے ہیں۔ مگر یہ سب کمالات اُس وقت پیدا کرتے ہیں جب اپنی زبان میں باکمال بن لیتے ہیں اور اپنی زبان کے نحو و صرف اور علم ادب کا ذوق اُن کے دل و دماغ پر پوری طرح حاوی ہو چکتا ہے۔

اس کا علاج یہ تھا کہ سررشتہ تعلیم کے اُردو مدارس کی اصلاح کی جاتی۔ مگر افسوس کہ یہ غیر ممکن ہے۔ اُردو مدارس کی حالت سدھار نے نہیں نہ آج تک کامیابی ہوئی۔ اور نہ کامیابی کی امید ہے۔ اس لیے کہ سررشتہ تعلیم ترقی تعلیم کا ذریعہ ہونے کے عوض اپنے خود غرض عمدہ داروں کے ہاتھوں ایک اعلیٰ درجہ کی تجارت گاہ بن گیا ہے اور اُنھیں لوگوں کی کتابیں داخل درس کی جاتی ہیں جو اپنے نفع میں عمدہ داروں کو شریک کریں۔ دکھانے کے لیے ایک بورڈ ہے۔ مگر بورڈ کے نفس ناطقہ ڈاکٹر صاحب ہیں جن کے اشاروں پر بورڈ چلتا ہے اور ڈاکٹر صاحب کی رائے دراصل اُن کے کسی عمدہ علیہ ماتحت عمدہ دار سررشتہ تعلیم کی رائے ہوتی ہے۔

گو ہندو خود کہہ رہے ہیں کہ اُردو ہماری زبان نہیں۔ وہ مسلمانوں کی زبان ہے۔ مگر باوجود اس کے اکثر یہی نظر آیا کرتا ہے کہ سررشتہ تعلیم کی اُردو کتابوں کے مصنف و مولف ہندو ہی ہوتے ہیں۔ یا کبھی مسلمان بھی ہوئے تو وہ جو سوا اس کے کہ سررشتہ تعلیم میں کسی خدمت پر متاثر ہیں ملک میں اُنھیں کوئی طرزی وقعت نہیں حاصل ہوتی۔ اسی خرابی کی وجہ سے اُردو نصاب تعلیم سے بدتر شاید کسی زبان کا نصاب نہ ہوگا۔ نحو و صرف۔ اور معانی بیان کے مفید رسالوں کا تصنیف ہونا درکنار یہ ہے کہ آج تک اُردو کی الف بے بھی صحیح اصول پر مرتب نہ ہو سکی۔

ایسی صورت میں اُردو کے درست ہونے کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ اور کس طرح سے ملک میں ملکی زبان کا سچا مذاق پیدا ہو سکتا ہے۔ بہر حال اُردو

مولوی سید نواب علی صاحب ضوی ایم۔ اے۔ ایس۔ سی۔ پرنسپل بروڈہ کالج کی کتاب تذکرۃ المصطفیٰ قیمت ۵۰ روپے اعلیٰ درجہ کی تصانیف میں ہے جو عمدہ جدید کو فخر کر چاہیے۔ ہم کبھی کیئذہ اُس پر مفصل ریویو کریں گے۔

خان بہادر حاجی سراج قادر بخش صاحب رئیس فیض آباد نے اس بات کی یادگار میں کہ انریبل مسٹر ہوز جیٹ سکریٹری لوکل گورنمنٹ اُن کی عیادت کے لیے اُن کے گھر پر تشریف لے آئے تھے علی گڑھ کالج کو دس دس روپے ماہوار کے دو وظیفہ عطا فرمائے۔ ہم خان بہادر کی عالی ظرفی کے معترف ہیں۔ کاش اُنھوں نے صحت کے لیے منت ماتی ہوئی کہ اچھے ہونے پر کالج کو دو وظیفہ دین کے تاکہ اُن لوگوں کے لیے ایک عمدہ نظیر قائم ہوتی جنھیں اپنے گھر میں کسی یورپین کی رونق افزائی کی عزت نہیں حاصل کر سکتی۔ اسپرٹل کونسل کے ممبروں کی فہرست شایع ہو گئی ہے۔ کل چونسٹھ ممبر ہیں۔ احتیاط انگلش مین راوی ہے کہ ایک بڑا سخت مسودہ انقباض اخبارات لیجسلیٹو کونسل میں پیش ہونے والا ہے۔

ملکیتہ میں ۲۶ جنوری کو نئی سرالٹاٹم ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے قتل کا واقعہ نہایت عبرت خیز ہے۔

دراغریوں کی بھی سنہ

ہمارے احباب ہم سے ہمدردی فرما رہے ہیں۔ اور دگلہ از جنکا ہے اور جن کے لیے یہ اُنھیں واقعی اُس سے دلی انس و محبت ہے۔ چنانچہ بعض احباب نے اُسکی صورت دیکھتے ہی توجہ فرمائی اور بعض ابھی تک نہیں چونکے۔ مگر ہم اُنھیں چونکاؤں گے۔ یوں نہ چونکے تو گدگدائیں گے۔ سالانہ قیمت اب صرف ۵ روپے۔ کم از کم اتنا تو ہو کہ ہمارا ہمدرد دگلہ از کا ایک اور خریدار پیدا کر دے۔ بھلا نہ بھی کوئی چیز ہے فقط زمان ہلانے کی دیر ہے۔ آپ کہیں اور آپ کے دوست نہ مانیں یا میں نہ مانوں گا۔ ہاں یہ کہیے کہ آپ خود ہی نہیں کہتے۔ خدا کے لیے اب کی نہ بھول جائیے گا۔ کمی ناول کی شکایت ہو تو ایک عمارہ ناول چھپ رہا ہے۔ مین چار مہینہ میں وہ بھی پیش ہو جائیگا۔ خاکسار۔ منیر دگلہ از



ذکر عیش و عشرت

سچے پاکیزہ عشق قیس عافری کی نسبت کہتے ہیں کہ اسے جو فرو دشت نجد میں تنہا بیٹھ کے قیلے آگے یا دکر نے اور لیلے کی خیالی تصویر سے باتیں کرنے میں آتا تھا کبھی خود لیلے کی صحبت میں نہ آیا۔ اور اسی طرح ہمیں بھی جن پیاری صورتوں سے انس ہے انکی یاد کے ہر دم تازہ رکھنے میں جو لطف حاصل ہوتا ہے خود ان سے ملنے میں ہمیں نصیب ہوتا ہے۔ حسینو۔ یہ کیا بات ہے کہ جو خوبیاں تمہارے خیال اور تمہاری یاد میں ہیں خود تم میں ہیں کیا ایسے کہ تم ہونا و جفا شعار ہو یا ایسے کہ تم نہیں کیا کرتے ہو؟ ہمیں ایسا نہیں ہے۔ یہی ہونا تو پھر تمہاری ان بے مہربانی کے خیال میں ہمیں کیوں غم آتا ہے؟ ہم نے تو ایسا جفا پسند دل بنایا ہے کہ تمہاری کج ادائیگوں تمہاری بے رحمیوں۔ اور تمہاری ستم مہربانیوں کو کبھی مٹانے کے یاد کیا کرتے ہیں۔ تمہارے چور سے بھاگتے ہوتے تو تمہاری جو رکے یاد سے دل بہنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟ جس سے کہ لطف ہوا چور۔ نظر عنایت ہوا کج ادائیغ غرض جس چیز سے دل کو کسی قسم کا انس ہو اس کے ذکر سے اور اس کی یاد میں جو لطف ہے خود اس میں ہمیں اور جس کے کہا ہے کہ ذکر عیش و عشرت ہی سچ کہا ہے۔ اور خوب کہا ہے۔

تو جو فرو دشت نجد کے خیال سے اور تمہاری باتیں اور تمہاری یاد کے اٹھا لیا ہو۔ وہ تم سے اور تمہاری صحبت سے نہیں اٹھا سکے۔ غم و سفر اور مصیبت و تکلیف کی حالت میں کبھی تم یاد آگئے ہو کیا تب باتیں کہ دل کو یہی تسلی اور تمہاری محبت بھری باتوں کے خیال سے کیسے سکون ہو گئی ہو تمہاری اس یاد ہی نے ہمارے دل میں یہی کشش پیدا کی کہ اولاً غری کی صدائے آوازوں اور ملکہ و ملک کی ہر دن بیٹن کو خدا مافکر کے بس یا ایک تمہارا شوق زلزلے سے وطن نے یکسر پرانے کی باتیں بیان پہنچنے کے تم میں وہ باتیں ہیں یا تمہاری یاد میں تھی۔

لیکن اسکا سبب کیا ہو کہ کسی چیز یا کسی شخص کی یا دین جلالت ہو خود اس میں نہیں نظر آ رہی بات بالکل عقل و قیاس اور فطرت و عادات کے خلاف معلوم ہوتی ہے کیونکہ عقل کا یہی فیصلہ ہونا چاہیے کہ میں خیر کے خیال تصور میں لطف ہے خود اس میں کہاں تک لطف ہو گا۔ بلکہ یہ بالذاتی ہے کہ ذکر و تصور سے بدرجہا زیادہ لطف خود اس کے حصول میں ہو۔ مگر نہیں۔ یہ قیاس کی غلطی ہے اور اسی قسم کی غلطی صلیبیات کل کے استقرائی فلسفہ کے مقابلہ میں لگے قیاسی فلسفہ سے ہو چا کر کی جھین۔ استقرائی کا بڑا عنصر تجربہ ہے اور تجربہ کے سامنے قیاس کو کی چیز نہیں جب ہم رد تجربہ کرتے رہتے ہیں کہ عین کا تصور و فہم سے زیادہ بگڑا ہوتا ہے تو پھر کیا کر سکتے ہیں کہ کوئی قیاسی معالطہ میں دھوکا دے سکے۔

خیر یہ ہے کہ ہی سبب علی زیادہ صحیح اور سچے ہوتے ہیں جو تجربہ کے بعد اس کی مناسبت میں قائم کیے جائیں۔ اور اسی نتیجہ کو ثابت کرنا جو تجربہ کے ذریعہ سے نظر آ چکا ہے چنانچہ اس اصول کے مطابق اب ہم بتاتے ہیں کہ ثابت کیے دیتے ہیں کہ سامان مسرت و ذکر سرست میں کیوں زیادہ لطف ہے۔

تاریخ اور واقعات عالم بتا رہے ہیں کہ عیش میں اکثر فخلل پڑ جاتا ہے۔ اور یہاں واقعات ایسے ناگہانی تردوات پیش آ جاتا کرتے ہیں کہ غم کو کر لاؤ لیشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ لاشکاشان و شوکت اور عطا سلطوت و جبروت خلیفہ کے واقعات میں مذکور ہے کہ ہفتہ یا اس کے زیادہ زمانہ تک مشہوق اور عیش و عشرت میں بسر کی اور نشاط عیش میں استغراق خود رفتہ ہوا کہ کہہ ٹھکانا لوگ کہتے ہیں کوئی صحبت عیش خانہ غم خالی نہیں مگر میرا جیسن طرب بھیرا کہ عکرو ترد کے رنگ سے ذرا بھی معشوش ہو پورے لطف کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے کہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ اس کی وہی محبوبت میں معشوقہ جو اس طرب میں اسکی انیس ہمد رہی تھی اسکے دل میں ایک رو اٹھا اور دم بھر میں ترپ کے مر گئی۔ اور وہ سبب عیش و طرب خاک میں مل گیا صحبت عیش ختم ہو گئی اور صد اس درد کی جگہ شور ماتم با ہو گیا چلے گئے کسی دن تک اسکی لاش دفن ہوئی لیکن اس کا کہ خود بھی اسی صدمہ جانکاہ میں جان دی۔ اور دونوں ساتھ دفن ہوئے۔

اس ایک واقعہ ہی پر موقوف نہیں۔ بڑے بڑے جہنوں میں اکثر ہی نظر آتا رہا ہے کہ کوئی نہ کوئی ایسی بات اٹھ کھڑی ہوئی جس نے سارا لطف خاک میں ملا دیا یا نیا میں ایسے صدمہ واقعات گزر چکے ہیں جو بتا رہے ہیں کہ عیش کی جھین شاد و نادر عیش عشرت ختم ہوتی ہیں۔ مگر ذکر عیش میں ایسے کسی فخل اور صدمہ کا اندیشہ نہیں۔ یاد اور تصور کا وہ دھبہ عالم ہے کہ اس میں آگے دینا کے آلام و افکار اور مصائب تردوات بھی پھر لطف میں جاتے ہیں۔ یہاں ٹرچکڑی بھی مزہ دیتی ہے۔

اور ایک خانم میں بھی اتنا ہی مزہ آتا ہے جتنا کہ کسی عیش و عشرت کی کہانی میں آتا ہے۔

عیش کے لیے ایک خمار لانی ہے جو عیش بے مشقت و راحت ہو اس کے بعد بہت طبیعت کٹنا کے مکدر ہو جاتی ہے۔ اور سرت و انسا طرہ جتنے زمانے تک از جس حد تک مزاج کو جوش و لب میں مصروف رکھا ہو راس سے ناپاؤہ زمانے تک اور اس سے بڑھ کے خمار عیش طبیعت کو لپست اور بے ذوق کر دیتا ہے۔ خمار کچھ شراب ہی کے ساتھ مخصوص نہیں عیش اور ہر راحت کے بعد ایک خمار ہے۔ مگر اس ناگوار اور اذیت رساں خمیا نہ عیش سے اگر خالی ہے تو ذکر عیش جس سے جتنی دیر تک چاہے لطف اٹھائے نہ طبیعت بد مزہ ہوگی۔ نہ فاسدگی و غمزدگی سے سابقہ پڑے گا۔ یہی خمار محبت عیش ہے جسکی بدولت انسان اکثر و فوراً طرب سے اگتا جاتا ہے مگر ذکر عیش میں یہ بات نہیں آتی چاہیں کہتے ہی زمانہ تک عیش و عشرت کے خیال میں محو رہیں دل نہیں گھبراتے گا اور طبیعت کا بار بار اتفاقاً صاف ہوگا کہ ع۔

بیٹھے رہیں تصور جانان کیسے ہوئے

جن محبتوں میں عیش پرستی حد سے گزری ہوئی تھی اور نہایت ہی بے فکری سے رنگ و لیاں منائی جا رہی تھیں انکا خاتمہ تم نے بار بار دیکھا ہوگا کہ کسی بد مزگی و تنقص پر جوجو دو گھرانے دنیا کے منہ لڑکے بگڑ گئے اور جو بڑی چل پل والے شہر ہر قسم کی جوسپیون کے کرتے دکھائے اچڑ گئے اور بڑی بڑی منور و ممتاز قومیں اپنی عظمت و جلال کا ترشاد دکھا کے یا بال ہو گئیں اور جو عایشان اور زبردست سلطنتیں شان و شوکت کے جلوے پیش نظر کر کے تباہ ہو گئیں۔ ان سے قطع نظر کر کے جس محبت شبیہ میں رات ہی کو ہر موقع ہو رہی تھی۔ اور دنیا کی تمام فکروں کو لٹا کر باوہ عیش کے جام لٹھکائے جا رہے تھے اسی کا انجام صبح کو جا کے دیکھو جب کہ رات بھر کی روتی ہوئی شمع کے آئینہ خشک ہو گئے ہوں۔ رات بھر کے جاگے ہوئے تاروں کی انگلیں نہ آلود ہو رہی ہوں اور سب سے مست حریفان محبت ایسے غافل ہوئے ہوں کہ کسی کو سرو باکی خبر نہ ہو۔ تو صاف نظر آجائے گا کہ عیش و عشرت کا انجام کیا ہوتا ہے اور کیا ہوتا رہا ہے۔

یہی حال اندھ کو کہ ہم اس صبح کو بھی پہنچ سکتے ہیں کہ عیش ایک غیر مستقل اور فانی چیز ہے۔ اور ذکر عیش نہایت ہی پائدار ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ عیش کے سامان تمھارے اختیار میں نہیں۔ تم ان سے اسی وقت تک لطف اٹھا سکتے ہو جب تک وہ تمھارے بس میں ہیں۔ اور یہ فیصلہ سے اکثر یہی ہوتا رہا ہے کہ وہ حلیدی چھین لے جاتے ہیں۔ مگر ذکر عیش ایسی لذت پائدار اور لازوال ہے۔

جسے کوئی سہین چھین سکتا۔

بہت سے تحقیق فلسفہ نے غالباً خیال اور یاد کے اس استقلال ہی کو دیکھ کے فیصلہ کر دیا ہے کہ مذاہب نے مابعد الموت کے عالم میں جس جنت و دوزخ کا وعدہ کیا ہے وہ دراصل اس عالم دنیوی کے اچھے کاموں کی مشرت اور بُرے کاموں کی مذمت سے عبارت ہے۔ یعنی عیش بہنیں۔ بلکہ ذکر عیش ہے اگرچہ ہم اس ملحدانہ رائے کے ماننے کو ابھی تیار نہیں ہیں لیکن اگر یہ صحیح مان لیا جائے تو صاف طور سے اس بات کا راز کھل جاتا ہے کہ ذکر عیش کیونکر ابدی ہے۔ اور خود عیش کے لیے فانی و نابا ہدار۔

فلسفیوں کا یہ دعویٰ صحیح ہو یا نہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اہل اللہ اور صوفیہ نے جو ذکر اور تصور کو اپنی اعلیٰ ترقیوں اور خدا رسی کا ذریعہ قرار دیا ہے محض اسی وجہ سے کہ ذکر باقی ہے اور جس مرتبہ کا ذکر کیا جائے وہ فانی۔

امیر عبدالقادر مغربی

جیسی شجاعت جیسی وفاداری جیسی استقلال اور جیسی پابندی عہد کی امیر ایک شریف اور مسلمان عرب سے کی جاسکتی ہے۔ اسکا سب سے آخری اور نہایت مکمل نمونہ امیر عبدالقادر مغربی تھا۔ جس نے اس انیسویں صدی عیسوی میں حمایت دین اور حمایت قوم کے جوش کو سلطنت فرانس کے مقابل میں ایسی شجاعت سے دکھا دیا کہ اس کے نام کو لیتا ہے دوام حاصل ہو گیا اور اس کے کارنامے رہتی دنیا تک اہل عالم کو یاد رہیں گے۔

بیچہ روم کے جنوبی سواحل ممالک بحیرہ یا مغرب میں شرق سے عرب کا ایک مغز قبیلہ ہے جو مرا بطین کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ مرا بطین اپنے آپ کو ہاشمی النسل بتاتے ہیں اور اسی مرا بطین میں ایک مدت مدید سے صاحب اثر اور اکثر اوقات برسر حکومت نظر آتے رہے ہیں۔ انھیں مرا بطین کا ایک مغز خاندان صوبہ اوراق کے شہر معسکرہ کے قریب آباد تھا جس کو یہ فخر حاصل تھا کہ اسی بن خشتہ امیر عبدالقادر موصوف پیدا ہوا۔

ان کی زندگی کا ابتدائی ورق لاعلمی کے خردان میں بند ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس لاعلمی ہی کے آغوش میں چھپا ہوا وہ علم حاصل کر رہا تھا۔ اور جب ششدری میں پہلے پہل کے نام کو پہچان میں شہرت حاصل ہوئی ہے تو اس وقت اس کی عمر تو اکیس ہی سال کی تھی مگر علم و فضل میں بڑے بڑے معمر سائنس دانوں سے گوی سبقت لے گیا تھا۔ کیونکہ وہ ایک بڑا جید عالم۔ اور واجیل تعظیم فاضل بن کے دنیا کی نظر گاہ عام میں آیا۔ اور اسکے ساتھ سب سے زیادہ مکرم و محترم ثابت کرنے والی یہ چیز تھی کہ علم باعمل تھا۔ وہ جتنا بڑا متبحر عالم تھا۔ اتنا ہی بڑا عابد و زاہد بھی تھا۔ اور سموطنوں میں فاضل گران پایا ہونے کے ساتھ اعلیٰ اور جہاں کا مستحق و پرمیہ کار بھی تسلیم کیا جاتا تھا۔ پھر اسی زمانے میں جب اس نے مسلسل دربار ارض حجاز کا سفر کر کے دوسرے جنوں کی فضیلت بھی حاصل کر لی تو لوگوں میں اس کا اثر اور بڑھ گیا۔ اور اب وہ ایک عالم اور مقتدا سے دین ہی نہیں۔ بلکہ ایک پاک باطن صوفی اور صاحب معرفت ولی اللہ بھی مانا جاتا تھا۔ لوگ اس سے تعلیم ہی نہیں پاتے تھے۔ بلکہ اس کے مرید بھی ہوتے تھے۔ ان دنوں فرانسیسیوں نے شمالی افریقہ کے مسلمان قبائل کو کمر زور پاکہ دیا اور ان کے شہر و اور موبوں کو مغلوب کر کے اپنے قبضہ میں لانا شروع کر دیا تھا۔ ان مسلمان ملکوں میں کوئی بڑی زبردست سلطنت نہ تھی جو دولت فرانس کا مقابلہ کرتی۔ متفرق قبائل اور ہر ہر شہر کے باشندے جدا جدا اپنی آزادی کے لیے لڑتے تھے مگر بار بار ناکام ہوتے اور پٹھ پٹھار کے رہ جاتے تھے۔ فرانسیسیوں کی باضابطہ فوج اور زبردست توپوں کے سامنے نہ بہادری کام آتی اور نہ کسی اور طرح زور چلتا۔

اپنے ملک کی یہ حالت۔ اور یہ قومی تباہی دیکھ کے عبدالغادر کو جوش آیا۔ اور ملک ملت کی حمایت میں جان کھپانے کے لیے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے باپ کو بھی اٹھارے اپنے ساتھ لے لیا اور بے تکلف جہاد کا نعرو بلند کر دیا۔ اور اس کے دے پہ ہوا کہ اہل وطن جان پر فحشیل کے فرانسیسیوں کو اپنے وطن سے نکال دیں۔ ملک نے بھی اس کی یہ خدمت پسندی۔ اور شہداء میں اس کے زیرِ نگر دس ہزار سپہروں کی جماعت تھی۔ خلیفہ کے اس نے شہر اور ان پر حملہ کر دیا۔ یہاں فرانسیسی قوت بڑے زور و زور پر تھی۔ اور مقابلہ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا چنانچہ کئی بار اسے سخت نقصان اٹھانے کے پسپا بھی ہونا پڑا۔ لیکن باوجود ان نقصانوں اور شکستوں کے لڑائی سے اس نے فائدہ ہی اٹھایا۔ ایک طرف تو یہ ہوا کہ یورپ افریقہ میں اس کی ضیاعت و سپہری کی دھوم ہو گئی۔ خود اس کے ہم وطن مطیع و فرمان بردار ہو کے اس کے اشار دین پر چلنے لگے۔

تہام قبائل عرب نے جن میں اکثر لڑائی رہا کرتی تھی اُسکے آگے سراطاعت مجبوا دیا۔ اور سب اُسکے جھنڈے کے نیچے لڑنے کو تیار ہو گئے۔

عنان سپہ سالاری ہاتھ میں لینے کے بعد عبدالقادر نے فن جنگ میں ایسی نمایاں ترقی کی کہ ساری دنیا چونک اٹھی۔ اور اُس نے اپنے ہمراہیوں کو یہ فن سکھا دیا کہ توپوں کی سخت سے سخت آتشباری میں ٹھہر کے کیونکر دشمنوں کا مقابلہ کریں۔ عرب لوگ توپوں سے بہت ڈرتے اور بے انتہا گھبراتے تھے۔ عبدالقادر نے دو ایک میدانوں میں انھیں نہایت خوبصورتی اور حسن تدبیر سے لڑائے کا میاب کر دیا تو وہ اُسکے اور زیادہ گرویدہ ہو گئے۔ اور فی لنون تک کو اس بات کا اعتراف ہے کہ عبدالقادر ہی تھا جس نے عربوں کو اس بات کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی کہ یورپ کی توپوں کے سامنے کیونکر ٹھہریں اور کس طرح یورش کر کے دشمنوں کی توپیں چھین لیں۔ ان مسلسل لڑائیوں اور یورشوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ فرانسیسیوں کو مجبوراً میر عبدالقادر کا دباؤ ماننا پڑا اور آخر ۱۸۴۷ء میں فرانسیسیوں۔ اور الجیریا والوں کے فی مابین ایک معاہدہ ہو گیا جسکی رو سے عبدالقادر شہر معسکر کا امیر اور صوبہ اوران کا فرمان روا تسلیم کیا گیا۔ اور ملک کی اندرونی تجارت پر اُسے محصول لگائے کا حق دیا گیا۔ یہ معاہدہ ہی تیار ہا جسے کہ عبدالقادر نے اوران کو بروقت فرانسیسیوں سے لے لیا تھا۔ اور اپنی قوت سے اُس نے وہ حقوق حاصل کر لیے تھے جو یورپ والوں سے کسی کو بھی مل سکتے ہیں۔

اس معاہدہ کے بعد اُس کی عظمت بہت بڑھ گئی مقتدا اُلی سے اُسے ملکہ اُلی مل گئی۔ اور مسند افتاء سے قدم اُٹھے۔ بڑھاکہ وہ سپر شہر بادی کی زینب زینت بن گیا اس موقع پر بعض بھائی نہاد اور نبی اعلم کہ اس پر جسد آیا جو تمہارا رسل کے اُسکی مخالفت کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ اکثر مشرقی ملک میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ جہاں خود غرضی قوی منافق پر ہمیشہ غالب آ جاتا کرتی ہے۔ مگر عبدالقادر کی شجاعت و خوش تدبیری ان سب گلوں پر غالب آئی۔ اور کل حریف اُس کے مطیع و منقاد ہو گئے۔

تاہم ان حریفوں کی مغلوبی۔ اور فرانسیسیوں سے معاہدہ ہو جانے کے بعد بھی میر عبدالقادر کو کبھی اطمینان سے بیٹھنا نہ نصیب ہوا۔ کیونکہ سلطنت فرانس کی طرف سے پھیر چایاں چلی ہی جاتی تھیں۔ اور وزنئے تھکڑے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ مگر عبدالقادر نے فتح فزون کے ہر طرح و انت کھٹے کر دیے۔ حتیٰ کہ بیان کیا جاتا ہے کہ زانیہ عظمت علی اور فرانس سے

اُس سے اپنے کیمپ کو ایک متحرک اور منتقل بند پر مبنی بنایا تھا۔ جو کبھی کمین ہوتا۔ اور کبھی کمین شمنین کو ایام جنگ میں اس کا پتہ پہنچا کر اس سے جملہ کہ وہ اور اُس کا شہر کہاں ہے لیکن شہر نام میں وہ فرانسیسی فوجوں میں اس طرح بکھریا کہ بھانسنے کی کوئی صورت نہ نظر آئی اور آخر اُسے محصور ہو کر فریج پر حملہ لا موری سٹیئر کے آگے بھجوا کر رکھ دیا پر اُسے بھجوا کر رکھنے سے پیشتر شرط ہو گئی تھی کہ وہ یا تو اسکندریہ میں بھیج دیا جائے گا اور یا ایک اور شہر میں جو سینیٹ جین ڈاکیئر کے نام سے شہرت رکھتا ہے لیکن گرفتار کر لینے کے بعد فریج گورنمنٹ نے بد عہدی کی۔ اُس شرط کے بجائے اس سے انکار کر دیا۔ اور عبدالقادر اپنے وطن سے نکال کے طولون کے ایک قلعہ میں زیر حراست رکھا گیا۔

سرسید نے اپنے سفرِ یورپ کے حالات میں جہاں پیرس کے واقعات بیان کئے ہیں یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ کسی کچھ انھوں نے ایک تصویر دیکھی جس میں یہ سین دکھایا گیا تھا کہ فرانسیسی سپاہیوں نے ایک اونٹ پر سے حمل کو گرایا ہے جس سے کئی جوان محصور ہوئے اور پھر ان کے زمین پر گر پڑے ہیں وہ سب بیکی کی حالت میں سمے ہوئے ہیں۔ اور فریج سپاہی اُن پر اپنی شنگینوں سے حملہ کرنے کو ہیں۔ دریافت کرتے سے معلوم ہوا کہ اس تصویر میں عبدالقادر کے حرم کی گرفتاری اور دولت فرانس کی عظمت دکھائی گئی ہے۔ سید صاحب کو یہ ناگوار ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اس تصویر کو فرانسیسیوں کی کم ظرفی پر محمول کیا۔ اور لکھ دیا کہ عبدالقادر کی عظمت و شجاعت دنیا کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی جس نے مدتوں دولت فرانس کو حیران و پریشان رکھا تھا۔ اس تصویر کو دیکھ کے سوا اس کے کہ خود فریج لوگوں کی لغویت اور ایک نہایت ہی ذلیل حرکت عالم آشکارا ہو عبدالقادر کے نام پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ بلکہ دیکھنے والے کو اس تصویر سے عبدالقادر کی بہادری اور شجاعت کا اور زیادہ یقین ہو جاتا ہے۔

عبدالقادر چار ہی سال طولون میں قید رہنے پایا تھا کہ خود شہنشاہ فرانس لوئی نیدولین کو اُس کے حال پر ترس آیا۔ اور اُسے اس شرط سے آزاد دی گئی کہ کچھ بھی ابھیر یا سین جاکے فرانسیسیوں سے مخالفت نہ کرے اور نہ اُن کے خلاف کوئی سازش کرے۔ اُس نامی گرامی شجاع عرب نے یہ شرط قبول کر لی۔ اقرار کیا کہ میں اب کبھی اسبا نہ کروں گا۔ اور دولت فرانس نے بھی مرضی کے مطابق اسے دولت عثمانیہ کے شہر بردس میں بھیج دیا جو ایشیا سے کوہِ کبک میں تھا۔

ہے چنانچہ ستمبر ۱۸۴۸ء میں وہ اپنے اس تھے مسکن میں پہنچا۔ یہاں چند ہی روز رہا تھا کہ اسے خاص قسطنطنیہ میں اقامت گزین ہونے کی اجازت اور آزادی مل گئی۔ اور اختیار تھا کہ قسطنطنیہ میں جہاں چاہے رہے۔ اور جہاں جی چاہے جائے۔

اسکے بعد ستمبر ۱۸۴۸ء میں پیرس میں ایک نمائش گاہ قرار پائی جسکی سیر کے لیے میر عبد القادر بھی آیا۔ اور سیر کر کے واپس گیا۔ ستمبر ۱۸۴۸ء میں ارض شام میں دروڑ کا ہنگامہ عظیم ہوا جس میں دروڑ لوگ جو نہایت ہی بہادر اور سخت ہیں عیسائیوں کے خلاف یلغار کھڑے ہوئے۔ اور قتل و خون کا بازار گرم ہونے کو تھا۔ اور کوہ لبنان کے علاقہ میں بیت سے عیسائی قتل بھی ہو گئے۔ امیر القادر نے اس موقع پر ٹری مروانگی و شرافت سے کام لیا۔ مسلمانوں کو اپنے ذاتی اثر سے روکا۔ اور چونکہ وہ مسلمانوں میں نہایت ہی ہرل عزیز تھا اس لیے اسکے درمیان میں پڑتے ہی مسلمانوں نے تلواریں میان میں کر لیں۔ اور جس عام خونریزی کا اندیشہ تھا نہ ہو پائی مسیحیت کو اس امر کا پورا یقین تھا کہ صرف عبد القادر نے انھیں اس موقع پر بچا لیا۔

انجیر پاکے شیوخ نے اب اسکے پاس باریا رسام بھیجا شروع کیے کہ پھر وطن میں واپس اسکے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لیجیے۔ اور فرانسینیوں سے لڑیے۔ دولت فرانس نے اگرچہ گرفتار کرتے وقت اس سے یہ عہدی کی تھی مگر اسکے قدم کو ہرگز لغزش نہوئی اور اہل وطن کو اسنے صاف جواب دے دیا کہ میں اب تمھارے کام کا نہیں رہا۔ اور فرانسینیوں کے میں نے جو عہد کر لیا ہے اس پر ہمیشہ قائم رہوں گا۔

ستمبر ۱۸۴۸ء میں اس نے پھر سفر حج کیا۔ اور ستمبر ۱۸۴۸ء میں دوبارہ فرانس کا سفر کیا۔ پیرس کو خوب پھر کے دیکھا۔ اور چند روز کے لیے لندن کی بھی سیر کی۔ اسکی زندگی پوری ویداری اور نیک نفسی میں بسر ہوئی۔ یہاں تک کہ آخر عمر میں پھر ملک مغرب کا سفر کیا۔ اور وہیں جو احرار محترمین ستمبر ۱۸۴۸ء میں وفات پائی اور اس پاک زمین میں آغوشِ محمد کے سپرد کیا گیا۔

عہد ارض شام میں یہ ایک مذہبی فرقہ جو لوگ شہر بہادر و راجہ مشہور ہیں الحاکم بابر السدا علی خلیفہ مکر کو وہ خدماتتے ہیں۔ اور انکی نفسی جزو کھلا کا ایک مجموعہ کے پاسی جگہ کو تاپا لدر و راکتے اور قرآن سے زیادہ مانتے ہیں انکے عقائد و عبادات آج تک دنیا میں ایک از سر بہتہ بنے ہوئے ہیں۔ یہ ظاہر ہو لوگ ین اسلام سے خارج ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ وہ ایک کلمانوں کا فرقہ ہے۔

۷ سیف و قلم

اس میں شک نہیں کہ سیف و قلم دونوں بلا کی قوت و عظمت رکھتے ہیں۔ اور جو اثر خدا نے ان دونوں کو دیا ہے کسی چیز کو نہیں دیا۔ مگر اسی قوت و عظمت نے دونوں کو ایسا از خود رفتہ کیا کہ نہایت ہی مغرور و تکبر ہو گئے۔ اور ان کے دعوے حد اعتدال سے گزرنے لگے۔ تلوار نے دعوے دانا و لا غیر ہی کے زعم میں دنیا بھر میں غل بچا دیا۔ ہر کہ شمشیر زندہ سکے بنامش خوانند۔ اور قلم کو جو جوش یا تواضع سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھ گیا اور معتبر شہادتوں سے اس پر یہ باغیانہ الزام ثابت ہو چکا ہے کہ حضور کرنگ امپر کے ہوتے قلم گوید کہ من شاہ جہانم،۔۔۔ ان جرمانہ و عودوں کا لازمی نتیجہ تھا کہ دولت برطانیہ کی سرپا انصاف عدالت نے دونوں کو سزا دی۔ تلوار تو آج سے پچاس سال پہلے ہی ہم سے چھین کے خاص شاہی محل میں قید کر دی گئی تھی۔ قلم باقی تھا۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے آغاز میں وہ بھی چھین لیا گیا۔ اور اسکی نسبت حکم ہوا کہ چند خاص ہاتھوں کی گرفت سے باہر نہ نکلے پائے۔

ان سزاؤں سے خود تلوار اور قلم پر کیا اثر پڑا اس کا حال تو خود ان سے پوچھیے یا ان لوگوں سے جنکے وہ قبضہ میں ہیں۔ یہاں ہم البتہ بالکل بیکار ہو گئے۔ جب تلوار ہاتھ سے لگتی ہے اسوقت نیتے ہوئے تھے تو اب قلم کو ہاتھ سے رکھ کے گونگے ہو گئے۔ بعض سرکش صاحبان و قلم نے ایسی تمردانہ آراء بیان دکھائیں کہ شاید ہمارے لئے اب یہ کہنے کا بھی موقع نہ باقی رہا ہوگا کہ جس تلوار کو ہر کہ شمشیر زندہ سکے بنامش خوانند، کا دعویٰ ہے۔ اور جس قلم نے یہ فرعونی دعویٰ کیا کہ میں شاہ جہانم، وہ حضور ہی کے سیف و قلم ہیں۔ دوسرے کے ہاتھ کے شمشیر قلم میں دم داعیہ کہاں؟ جو تلوار اور جو قلم کہ رعایا کے ہاتھ میں ہوں ان کی اتنی مجال کہاں کہ ایسا انا و لا غیر کا شور مچائیں ہمارے ہاتھ میں اگر تلوار بھی تھی تو حضور ہی کی دی ہوئی۔ اور حضور کی تلوار کے اشاروں پر چلنے والی اسی طرح ہمارے ہاتھ میں قلم تھا تو حضور ہی کا عطا کیا ہوا۔ اور حضور ہی کے بتائے ہوئے اصول پر چلنے والا۔ مگر انہیں اس کہ سرکار کو اعتبار نہ آیا۔ اور یہ دونوں شرافت کے تمنعے ہم سے چھین گئے۔

ہمارے ہاتھ کی تلوار اگر ملک میں کوئی سکے ٹھکانی تو وہ آپ ہی کا سکے ہوتا۔ اور ہمارا

قلم و دعا سے سلطنت کرتا تو وہ آپ ہی کی سلطنت ہوتی جسے وہ اپنی سمجھتا اور اس پر ناز کرتا۔ لیکن خراب تو جو ہونا تھا ہوا۔ آپ جیسا چاہتے تھے ویسا ہی فیصلہ ہو گیا۔ لیکن اس فیصلہ کے وقت ہم سمجھتے ہیں کہ ایک بہت ہی فردری اصول پر حضور کی نظر نہیں پڑی۔ جس کی طرف تو یہ کرنا ہمارے خیال میں نہایت فردری تھا۔

انسان کے جسم میں کبھی کبھی دو چار پھوڑے پھنسیاں نہ نکل آئیں تو مادہ فاسد سارے جسم کو سڑا دے۔ اسی طرح اگر وہ زمین پر اگر چند آتش فشاں بہا رہے ہوں تو ساری زمین بخارات و غبار سے زور و جوش سے پاش پاش اور غارت ہو جائے۔ لیکن جن چیزوں پر منحصر نہیں رہے جوش کے لیے نکلنے کا کوئی ایک راستہ فردر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور ایک جاہل معمار بھی اس اصول کو خوب سمجھا ہوا ہے کہ مکان میں اگر مہری نہ بنائی جائے گی تو ایک ہی برسات میں سہدم ہو جا گا۔ اصول جنگ میں بھی اس کلیہ سے ورگزر نہیں کیا جاتا کہ ایک مجبور و مایوس اور جان پر کھیل جانے والے محصور حریف کے لیے اس حد تک راستہ چھوڑ دیا جانا چاہیے جہاں کہ اس کا جوش جان باری فرد ہو جائے۔

لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ بالکلیہ کی دنیا میں آکے یہ عام قاعدہ حضور کے ذہن سے کیوں اُتر گیا۔ انسان کو دلی جذبات کے ظاہر کرنے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے قدرت نے دو طریقے عطا کیے ہیں۔ ایک زبان جس کا سفیر قلم ہے اور دوسرا ہاتھ جو تلوار سے کام لیا کرتا ہے۔ کسی کو جب کسی پر غصہ آتا ہے۔ کسی سے ملال ہوتا ہے تو وہ یا تو سخت سست الفاظ کہتا اور گالیاں دے کے اور خوب جی بھر کے کوس کے دل کی بھڑاس نکال دیتا ہے۔ اور یا تلوار سے کام لیتا ہے۔ اور اپنی یا خیر کی جان کے درپے ہو جاتا ہے۔

غیظ و غضب ہی پر غرور و ہمنیں اگر غرور سے دیکھیے تو انسان خیالی آفرینیوں کی ایک کل ہے جس کے اندر ہر طرح کی طرح کے جذبات حرکت میں آتے رہتے ہیں۔ اور ہر دم تک تازہ جوش پیدا ہوتا ہے۔ ان جذباتوں اور جوشوں کے نکلنے کے یہی دو راستہ ہیں زبان اور ہاتھ۔ اور زبان اور ہاتھ کے اوزار قلم اور تلوار ہیں۔ جب یہ دونوں راستہ بند ہو گئے۔ اور لوگ اپنے نجارات کو نہ زبان سے نکال سکیں گے اور نہ ہاتھ سے تو پھر ان نجارات کے دل میں محبتس ہونے اور سینے میں دبے پڑے رہنے سے جن خرابیوں فسادوں اور فتنوں کے

پیدا ہونے کا اندیشہ ہے وہ معمولی نہیں تصور کیے جاسکتے۔

سب سے بہترین حکمت علمی یہی تھی جس پر ہماری سلطنت کا اس سے پہلے عمل درآمد تھا یعنی تلوار چھین کے ہاتھ کی قوت جو نہایت ہی خطرناک اور امن و امان میں خلل ڈالنے والی ہوتی ہے تو ردی گئی۔ اور زبان و قلم کو آزادی دے دی گئی کہ جو چاہیں کہیں اور جڑا بھلا جودل میں آئے لکھ ماریں۔ اُن کے لکھ مارنے یا زبان سے کب ڈالنے سے نہ سلطنت کے کسی انتظام کو نقصان پہنچ سکتا تھا اور نہ ملک کے امن و امان میں کسی قسم کا خلل پڑ سکتا تھا۔ کیونکہ فتنہ انگیز چہ جس سے عبارت شمشیر تیراں ہے اُن کے ہاتھوں سے چھین لی گئی تھی۔ اور اگر وہ شیر غراں بھی تھے تو اُن کے ناخن کاٹ لیے گئے تھے۔

لیکن قلم کے چھین لینے کے بعد اظہارِ جوش کا وہ ایک بے خطر راستہ جو کھلا ہوا تھا وہ بھی بند ہو گیا۔ اور گویا اس کا سامان کر دیا گیا کہ رعایا کے دونوں میں، یا سرکار کے چند خواجہ ہر کسی کے سینوں میں جس قسم کا جوش پیدا ہو وہ اندر ہی اندر بند رہے کے زیادہ پرورش پائے زیادہ پختگی اور قوت حاصل کرے۔ اور جس سینہ میں بند ہے۔ اُس سے ایک بڑی دہلا دینے والی آواز کے ساتھ پھوٹے جس طرح کہ کوئی زبردست پرا تو پھٹتا ہے۔ اور اُسکی آواز دور دور تک گونج اٹھتی ہے۔

شخصی سلطنتوں نے اکثر اوقات اسی قسم کی غلطیاں کی ہیں۔ اور اپنی ناقصیت اندیشی سے رعایا کے دل و زبان اور دست و قلم پر پورے چھائے ہیں۔ اور ہمیشہ اسکا پُرا نتیجہ ظاہر ہوا ہے۔ لیکن آزاد خیال برٹش نیشن سے ایسی فروگزاشت اور تنگ خیالی کی ہم کو امید نہ تھی۔ یہ ہم کے گولے جو کبھی کبھی برآمد ہوئے پھوٹے ہیں اور سارے ہندوستان میں اُن کا شونج جاتا ہے۔ اُن کا انسداد اور تدابیر سے بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ انتظام کہ صد ہا سینہ خطرناک جوش فساد سے لبریز ہو کے خود ہی ہم کے گولے بن جائیں بدرجہا زیادہ خطرناک ہے۔ مگر ہمیں اس موقع پر اپنا خیال ظاہر کر دینا تھا اور نہ ہمیں اس قسم کے امور سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ۔ ع رمز مملکت خویش خروان دانند۔

اردو لٹریچر

ایک بہت بڑی کمی ہمارے لٹریچر میں یہ بتائی جاتی ہے کہ اردو میں اسوقت تک علمی

مصطلحات کی بہت کمی ہے۔ اور ہم حقیقت کسی علمی مسئلہ کے متعلق یا کسی فن کے سائل پر بحث کرنا چاہیں تو مجبور ہیں کہ اگر وہ کوئی قدیم علم و فن ہو تو عربی کے اصطلاحات اختیار کریں۔ اور اگر کوئی نیا علم و فن ہو تو انگریزی کے اصطلاحات لکھا جاتا ہے کہ اہل عرب نے جب ان علوم کو لیا ہے۔ تو خاص اپنی زبان میں سے اصطلاحی الفاظ تراش لیے تھے جبکہ یہ برکت تھی کہ غیر زبانوں کی غلامی سے آزاد ہو گئے۔ اور عربی بجائے خود ایک علمی زبان بن گئی۔ مگر ہم سوا دوسری زبانوں کی خوشہ چینی کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔

یہ کمی اس قدر محسوس کی جا رہی ہے کہ ہندو مسلمان دونوں اس فکر میں ہیں کہ اپنے اپنے مذاق کے مطابق علمی اصطلاحات تصنیف کریں۔ ہندو چاہتے ہیں کہ ہندی میں لکھنے والے اصطلاحات ہوں اور انکا ماخذ سنسکرت قرار دیا جائے۔ مسلمان چاہتے ہیں کہ اردو کی اصطلاحات کے لیے عربی زبان ماخذ اصطلاحات قرار دیا جائے۔ اور جتنے اصطلاحات لیے جائیں عربی سے لیے جائیں اسی دامن میں دونوں گروہ طرح طرح کی کوششیں کر رہے ہیں کوئی چاہتا ہے کہ اصطلاحات کی ایک جدید کتاب لغت تصنیف کر کے شائع کر دیا جائے۔ کوئی تھوڑے تھوڑے اصطلاحات بنا کے اخباروں اور رسالوں میں شائع کر دیتا ہے تاکہ عام لوگ ان کو اختیار کر لیں۔ اور وہی مصطلحات آئندہ علمی کتابوں میں اختیار کیے جائیں۔ جدید علوم جواب سے نئے یورپ میں پیدا ہوئے ہیں انکی اصطلاحات کے ترجمہ کی کوشش چند روز ہوئے مگر میں بھی ہو رہی تھی۔ اور متعدد علمائے اپنی متحدہ کوشش سے اس قسم کے نئے عربی اصطلاحات تراش تراش کے وہاں کے رسالوں اور اخباروں میں شائع کرنا شروع کئے تھے مگر یہ ہے کہ سب لوگ عام اس سے کہ مگر کے ہوں یا ہندوستان کے اور ہندو ہوں یا مسلمان سب غلطی پر ہیں۔ اور انکی یہ سب کوششیں نقش بر آب ہیں۔ نہ انکے تراشے ہوئے الفاظ زندہ رہ سکتے ہیں اور نہ ان سے انکے لہجہ کو کسی قسم کا نفع حاصل ہو۔ یہ ایک سانپ کا اور کھلا ہوا مسئلہ ہے کہ لغت زبان کا تابع ہے نہ یہ کہ زبان لغت کے تابع ہو جو الفاظ کسی زبان میں پیدا ہو جکتے ہیں۔ عام اس سے کہ اس زبان کے اصلی الفاظ ہوں یا کسی دوسری زبان سے لیے ہوئے ان کا اشتقاق بہستقصا کر کے کتب لغت مدون کیے جاتے ہیں۔ مگر آج نئے نیامیں کمی یہ نہیں ہو کہ الفاظ عام اس سے کہ مصطلحات ہوں یا عام قسم کے کتب لغت سے لیکے تحریر و تقریر میں شامل کیے جائیں۔ اصطلاحات کی تصنیف و ایجاد کا صحیح محل یہ ہے کہ ہر فن پر ایک کتاب

تصنیف کی جائے۔ اور اس میں ضرورت کے مطابق نئے اصطلاحی الفاظ تراش کے کام میں لائے جائیں۔ اور جب وہ کتاب میں اس فن کے لفظ میں شریک ہو جائیں تو ان سے لے کے وہ معطل الفاظ لغت میں اضافہ کیے جائیں۔

لیکن یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ اور نہ اس قسم کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس وقت مکتبہ قجی کتابیں علوم قدیمہ و جدیدہ کی اردو میں لکھی گئیں ان سب میں عموماً یہی طریقہ اختیار کیا گیا کہ بجائے اس کے کہ اصطلاحات کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈھے جاتے عربی و انگریزی کے الفاظ جیسے نقل کر دیے گئے۔ جن سے حرف اردو جاننے والے نہ مانوس ہیں اور نہ انہیں صحیح طور پر زبان سے ادا کر سکتے ہیں۔ ان اصطلاحات کی غیر مانوسی کی وجہ سے علوم و فنون کی تعلیم ہندوستان میں کسی طرح عام نہیں ہو سکتی۔ اور اردو لٹریچر کے حامیوں کو اپنے سامنے ایک ایسی دشواری نظر آتی ہے جو کسی طرح ٹھائے نہیں سہتی۔

اس مشکل کا اصلی راز وہی ہے جو اسی معنوں کے پہلے حصہ میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ یعنی اردو تعلیم کا ناقص ہونا۔ اردو مذاق کا مغلوب رہنا۔ خود اہل زبان کا اپنے وطنی لٹریچر سے مطمئن نہ ہونا۔ اور خاص اردو زبان کے متعلق مسائل میں بھی اردو دان کے مقابل عربی و انگریزی جاننے والوں کے اثر کا زیادہ ہونا۔ ہمارے سامنے سب سے بڑی مثال بابلون کی ہے انہوں نے جو وقت یونانی و رومی اور دیگر السنہ کے علوم و فنون اپنی زبان میں لیا ہے اس وقت چند صدیوں پہلے علوم تھے۔ اور جس پبلک کے سامنے پیش کرنے کے لیے وہ کتب عام کا ترجمہ کرتے اس ترجمہ کا ذوق غالب تھا۔ اس میں حرف اپنی مادری زبان کا جاننا والا دیگر السنہ کے ماہرین کے سامنے ذلیل و کم وقعت نہیں تصور کیا جاتا۔ بلکہ حتیٰ الامکان اس قدر غالب تھا کہ مترجمین اگر اس کے خلاف ہائوس سے نامناسب روش اختیار کرتے تو اپنی کوشش میں سرسبز نہ ہو سکتے۔ اس لیے وہ مجبور تھے کہ ہر اصطلاح کے مقام پر کوئی عربی ہی لغت اختیار کر کے بلا لحاظ اس کے کہ لغت وہ اصلی یونانی و رومی الفاظ کا پورا پورا ہم معنی ہو یا نہ ہو جب وہ ایسے الفاظ کو اختیار کر لیتے تو کتاب کے مشہور ہونے ہی وہ علمی دنیا میں مقبول ہو جاتے۔ اور اصل میں نہ بھی ہوتے تو اصطلاح قرار دیے جانے کے بعد ان یونانی و رومی اصطلاحی الفاظ کے ہم معنی بن جاتے۔

خود اردو زبان میں بھی ہمارے سامنے ایک اسی قسم کی نظیر موجود ہے یعنی تعزیرات ہند

اور دیگر کتب قوانین کا ترجمہ جب اردو زبان میں کیا گیا۔ اور گورنمنٹ نے چند قابل بزرگوں کو اس خدمت پر مامور کیا تو انھوں نے تمام قانونی مصطلحات کے لیے جو الفاظ مناسب معلوم ہوئے تراش کے قائم کر دیے۔ گو ان الفاظ سے اس سے پہلے کبھی اصطلاحوں کا کام نہیں لیا گیا تھا۔ اور پہلے پہل جب کام میں لائے گئے ہیں بعض لوگوں کو بھدے گراں۔ اور غیر مانوس معلوم ہوئے ہوں گے۔ مگر جیسے ہی وہ قانونی کتابیں ملک میں پھیلین عدالتوں نے انکی طرف توجہ کی۔ دکلا اور اہل مقدمہ ان سے کام لینے پر مجبور ہوئے وہ اصطلاحیں پچھ پچھ کی زبان پر چڑھ گئیں۔ اور ان میں نہ کسی قسم کی گراہی تھی اور نہ کسی طرح کی نامانوسی۔ اور جہد روز بعد وہی الفاظ قانون کی کتابوں سے لیکے کتب لغت میں بھی درج کر دیے گئے۔

لہذا یہ کمی یوں نہیں پوری ہو سکتی کہ ان اصطلاحات کی ایک کتاب لغت تصنیف کر کے شایع کر دی جائے۔ بلکہ انجمن اردو۔ یادگیر حامی زبان انجمنوں کا کام بجائے لغتوں کے تصنیف کرانے کے یہ ہونا چاہیے کہ جن علوم و فنون کے اصطلاحات نیا نا منظور ہوں انھیں کے متعلق جامع و مانع اور مختصر سارے تصنیف کر کے شایع کیے جائیں اور ان میں اصطلاحات کا ترجمہ مناسب الفاظ میں کیا جائے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ مصطلحات کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ عربی سے علوم قدیمہ کے جو پرانے اصطلاحات اردو میں لیے جا چکے ہیں وہ تو وہی برقرار رکھے جائیں اور علوم جدیدہ اور خاصہ سائنس کے لیے نئے اردو یا عربی اصطلاحات پیدا کرنے کے بجائے انگریزی مصطلحات جیسے اردو میں نقل کر لیے جائیں لیکن اس سے اردو کوئی علمی زبان بن سکتی اور نہ اردو لٹریچر اپنی کوئی وقعت قائم کر سکتا ہے۔

علم طب کے متعلق کون کتاب یا کون سا مسئلہ ہے جس کا ترجمہ فارسی یا اردو میں نہیں ہو گیا۔ بلکہ مفردات اور نیز قرابادینوں کے لحاظ سے دیکھو تو فارسی و اردو کی نو تصنیف کتابیں زیادہ عادی اور جامع ہیں لیکن محض اسوج سے کہ طب کے تمام مصطلحات عربی کے ہیں اس فن میں فارسی و اردو دونوں عربی کی غلامی سے آزاد نہ ہو سکیں۔ چنانچہ عربی زبان نہ جانتا ہو تندر اور باوقفت نہیں مانا جاتا جسے کہ خیالی شخص کے ذہن نشین ہے کہ بغیر عربی پڑھے طب آہی نہیں سکتی۔ اسی طرح اگر آپ سائنس کے متعلق اصطلاحات کو انگریزی سے جیسے نقل کر لیں گے۔

قلع نظر اسکے کہ علوم سائنس اُردو دان طلبہ کے لیے بالکل غیر مانوس اور ناقابل فہم ہیں گئے محض اُردو میں سائنس کی تعلیم پانے والوں کا علمی دنیا میں کوئی اعتبار نہ قائم ہو سکے گا۔ اور ہمیشہ یہی سمجھا جائے گا کہ بغیر انگریزی پڑھے سائنس آہی نہیں سکتا۔

بہر تقدیر حایان اُردو کو اگر اُردو سے کسی قسم کا انس ہے تو اُن کا فرض ہے کہ اُردو میں سائنس کے فنون کا ترجمہ کریں۔ اور مصطلحات کے معنوم کو خوب سمجھ کے انکی جگہ مناسب الفاظ عام اس سے کہ وہ اُردو کے ہوں یا فارسی کے یا عربی کے استعمال کریں اگر اُن کو کھانا کو ذرا بھی مقبولیت حاصل ہوئی (اور ضرور حاصل ہوگی) تو ہم کو یقین ہے کہ اچھے خاصے مصطلحات بن جائیں گے اور اُردو چند ہی روز میں ایک علمی زبان بن جائے گی۔

ایسے مصطلحات کے کام میں لاتے دقت اس بات کا زیادہ لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ الفاظ خوبصورت۔ سوزون اور پوری طرح ہم معنی ہیں یا نہیں۔ کیونکہ ابتدائی استعمال کے وقت ہر خوبصورت سے خوبصورت لفظ بھی اُس محل پر بیونڈا اور اٹھ اُہوا معلوم ہو گا۔ اور یقین کر لو کہ مصطلحات جس زبان میں قائم کئے گئے ہوں گے پہلے پہل ایسے ہی بھونڈے اور غیر مانوس نظر آئے ہونگے۔ الفاظ مصطلحات کو صرف استعمال مانوس اور خوبصورت بناتا ہے۔

زبان اُردو کا نیا سرمایہ

آصف اللغات۔ نواب عزیز جنگ بہادر حیدر آباد دکن کے اُن چند منتخب لوگوں میں ہیں جنہوں نے علم سے فائدہ اٹھانے کی پوری قابلیت کے ساتھ وقت کی قدر قیمت جاتی ہے وہ ایک وظیفہ یاب عمدہ دار سرکار نظام ہیں۔ اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی علمی مشغلہ ضرور جاری رکھتے ہیں فی الحال چند روز سے انہوں نے ایک نئے اور بالکل چھوٹے رنگ کی کتاب نوٹ تفسیٹ کرنا شروع کی ہے جسکی پہلی جلد چھ سات مہینہ ہوئے شایع ہوئی تھی اب دوسری جلد ہمارے سامنے ہے۔ یہ دونوں جلدیں ۱۲۰۶ صفحوں پر ختم ہوئی ہیں۔ کاغذ چھپائی لکھائی اور ترتیب سے کتاب اعلیٰ درجہ کی ہے۔ اور ہر جلدی جلدی بجائی ہے ہتھکاب و تکمیل کا پتہ اس سے لگ سکتا ہے۔

کہ ملی ظنعت ابھی الف محدود بھی نہیں ختم ہوا۔ اصل میں یہ نعت مصطلحات فارسی کا ہے۔ اور فارسی ہی میں معنی بتائے گئے ہیں۔ مگر نئی اور انوکھی بات یہ ہے کہ انہیں فارسی محاورات کے سلسلہ میں اردو محاورات بھی تبا دیئے گئے ہیں جنکا مطلب اردو میں بتایا ہے۔ نعت نہر کسنسی لارڈونٹو سبا درو الیرا ہے ہند کے نام پر ڈیٹی کیٹ کیا گیا ہے۔ اور ہر جلد کی اشاعت پر گورنمنٹ آف انڈیا سے پانچ سو روپیہ اور گورنمنٹ نظام سے پانچ سو روپیہ قابل مصنف کو انعام ملتے ہیں جسکی وجہ سے مصنف صاحب نے کمال فیاضی اس نعت کی قیمت میں اصل لاگت سے ایک ٹکٹ حصہ بیک کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ اور ہر جلد کی قیمت یک مقرر کی ہے۔ اسکے علاوہ ۲۵ جلدیں علیگڈھو کے طلبہ کو اور ۵۰ جلدیں عام قہر دانان سخن کو مفت دیتے ہیں۔ ہم نواب صاحب کو ان کی کامیابی پر مبارک باد دیتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ ہندوستان کی پبلک ان کی اس تصنیف کی اور نیران کی قدر کرے گی۔

مکمل ریویو انشاء اللہ بقید حیات ہم اسوقت لکھیں گے جب کتاب تکمیل کو پہنچ جائیگی۔

صوفی یہ نقیصہ کا ایک اعلیٰ درجہ کا رسالہ ہے جو مولانا محمد الدین آوان حشیتی نظامی حیدری کے زیر انتظام مقام بندی بیار الدین ضلع لکھنؤ پنجاب، سے حضرت سید حیدر شاہ صاحب جلال پوری کی یادگار ہیں۔ ماہوار شایع ہوتا ہے۔ فوری سالہ ۱۹۰۷ء کا رسالہ جو ہمارے سامنے ہے ۴۴ صفحوں پر ختم ہوا ہے۔ اور قیمت صرف ۱۲ سالانہ ہے۔ مضامین نقیصہ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو پوری طرح رنگ بین ڈوبا ہوا ہے۔ اور بہت سے اعلیٰ درجہ کے مضامین اس کے صفحات پر نظر آتے ہیں۔ لیکن ایڈیٹر صاحب کو ہم مشورہ دین گے کہ بجائے حد سے گزرے ہوئے خوارق عادات۔ اور بہت سی عام مستحکم کی باتوں کے۔ وہ زیادہ گہرے مذاق توحید۔ اور زیادہ سنجیدہ مسائل فلسفۃ الہی کی طرف توجہ کریں مجھے یقین ہے کہ حضرت صوفیہ اور عام مسلمان اس رسالہ کی قدر کریں گے۔

دُلکداز

ہمارے بہت سے کرمفرماؤں نے ہماری فرمائشیں اور بے انتہا توجہ سے کام لیا۔ لیکن پرانے احباب میں سے ابھی بہت سے اس طرح خاموش ہیں کہ گویا انھیں خبر ہی نہیں ہوئی۔ وہ کہہ گدائے سے نہیں خبر ہوتے تو شاید اسکے منتظر ہیں کہ ہماری پروردگار دُلکداز انھیں بچپن کرے؟ اور تیار ہو کے کہیں کیا کہتے ہو۔ سچ کہتے ہیں کہ آخر العلاج اے۔



صد بار ہاک کیا اور پھر وہی گلے کا بار! ہزاروں دفعہ فوج کے پھیکا۔ اور پھر سلیط
 گلو گرا آہ! کیا کریں کہ اس عالم گریبان سے پیچھا چھوٹے۔ آہنی بیڑیاں کٹ جائیں۔
 فولادی ہتکڑیاں ٹوٹ جائیں۔ مگر اس کمزور گریبان کے طوق و سلاسل سے گلو خلاسی
 نہ ہو! کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ دل نادان کی بتایوں نے! دھڑلہ حالت کر رکھی ہے کہ جب
 جوش آجائے گریبان پر ہاتھ پڑھاتا ہے۔ اور بے دھیان ڈرانے نہیں۔ بتا۔ ہم نے اپنی
 بیتابانہ شور و شکر کا ہفت اسی گریبان کو بنا رکھا ہے۔ کسی کی پیاری صورت دیکھی اور گریبان
 فوج ڈالا۔ کسی کی چشم نشان کا سامنا ہوا اور گریبان کا ایک تار نہ باقی رہا۔ کوئی شعر اچھا
 معلوم ہوا اور ہاتھ گریبان پر جا پڑا۔ کوئی پورانی صحبت پر ہم یاد آئی اور گریبان کو لے ڈالا۔
 کسی کی پروردگار آواز کان میں آئی۔ اور گریبان کے سر ہو گئے۔ اور کسی کے چہرہ دون
 کی جھٹکار کان تک پہنچی اور گریبان کے پیچھے پڑ گئے۔ مختصر یہ کہ جس چیز کو جی چاہا اور اس پر
 قابو نہ چلا تو ہم ناکامی کا سارا بغض گریبان ہی پر کال ڈالتے ہیں۔ کیونکہ جب اور کسی پر زور
 نہ چلے تو اسے گریبان پر خوب زور چل جاتا ہے۔ گریبان از خود زخماں عشق اور بیخودان
 ذوق کے عالم میں دل کی بھڑاس نکالنے کا ایک ذریعہ بنا ہوا ہے۔ اور اسے چاک کر کے
 ہم اپنے حسرت و غم کو تسکین دیا کرتے ہیں۔

گریبان کی طرح لباس کے بعض اور حصوں کو بھی امتیاز اور شہرت حاصل ہے۔ ٹوپی
 اور بگڑتی اعلیٰ ترین حصہ جسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اسی مناسبت سے ان کی قدر و منزلت
 بھی بڑھی ہوئی ہے۔ اگلے درباروں میں بادشاہوں اور عالی مرتبہ شاہزادوں کی تعظیم

کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ ان کے سامنے بغیر دستار کے کوئی نہ آئے۔ اور اگر دستار نہ ہو تو ٹوپی اتار لے۔ گپیا کی لاج دیہاتیوں تک میں شہرت رکھتی ہے۔ اور کسی کی ٹوپی اتار لینا اُس کی بے عزتی کرنے کے حکم میں ہے۔ شرارے رند مشرب کے بخودان شوق بھی جا ہے جناب بلخ کی دستار اتار لین۔ یا حضرت زاہ کا عامہ اچھال دین مگر اپنی گپڑی سنبھالتے ہی رہتے ہیں۔ اسی گریبان کو بعض اور حقیقتیں بھی حاصل ہیں۔ ایک مظلوم مظلمہ خواہی کے جوش میں اپنا ہاتھ ناحق ناشناس ستم کش کے گریبان میں ڈال دیتا ہے۔ اور جب تک اُس کی داد نہ مل جائے نہیں چھوڑتا۔ دامن وہ ظلِ عاطفت ہے کہ اُس کے سایے میں قسمت کے ستارے ہوئے پناہ لیتے ہیں۔ اور جس کسی کو دوسری پر بھارنا ہوتا ہے اُسکا دامن پکڑ لیتے ہیں۔ الغرض گریبان کی طرح اور بھی بہت سے اجزاء لباس کو نمود اور امتیاز حاصل ہے۔ مگر وہ خصوصیت و شہرت جو گریبان کو حاصل ہے کسی کو نہیں نصیب۔ گریبان نے عشق و بخودی کے عالم میں عجب قسم کی شورش پیدا کر دی ہے۔ اور شعر و سخن کی دنیا میں حیرت انگیز شوش نمایان کر رکھا ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس نے شعر کے کلام میں بے قراری کی ایک نئی روح پھونک دی ہے۔

لیکن بقرانِ شوق کی حالت کا اندازہ کیجیے تو اس کا پتہ لگانا دشوار ہے کہ شرابا عشاق خستہ جگر کو گریبان سے اُس دجبت ہے یا دمنی وعداوت۔ جس بے رحمی و بے دردی سے وہ گریبان کو بھاڑتے اور اُس کی دھجیان اڑایا کرتے ہیں اُس سے تو خیال ہوتا ہے کہ انھیں گریبان سے قطعی عداوت ہے۔ مگر اسکے ساتھ یہ بھی نظر آتا ہے کہ ہر وقت اُسے گلچے سے لگائے رہتے ہیں۔ اور بخودی کے جوش میں اگر سو بار بھاڑتے ہیں۔ تو اتنی ہی دفعہ بیٹھ کے اُس میں رونم بھی کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک اگلا بقرار عشق اپنی بتیا بیوں کے اظہار کے ساتھ گریبان سے ہمدردی کرتا اور کہتا ہے۔

از چہ من چاک گریبان گلہ دارد وز گریہ من گوشہ دامن گلہ دارد

شعر کی حس بڑھی ہوئی ہے۔ اور جو کہ خیال آرائیوں کے عادی ہوتے ہیں ایسے ہر چیز کے مختلف جہات اُن پر مختلف قسم کا اثر کرتے ہیں۔ گریبان سے انھیں یہ توفائہ پہنچتا ہے کہ جب آتشِ درونی کا جوش ہوتا ہے اور شوق کی حسد میں دل

میں اس درگجھڑاٹ پیدا کرتی ہیں تو اس پر ہاتھ صاف کر کے غم و غصہ سے پیچھا چھڑاتے۔ دردم بھر کے لیے دل کو تسکین دے لیتے ہیں۔ اس جہت سے گریبان انھیں نہایت عزیز ہے۔ کیونکہ غم غلط کرنے اور دل کا اُبال نکال ڈالنے کے لیے اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں مل سکتا۔ اور اسی لیے اس میں بار بار درخو کرتے ہیں کہ جوش دل نکالنے کا جو ایک ذریعہ آگیا ہے ہاتھ سے نہ جاتا رہے۔ مگر اس کے مقابل انھیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ گریبان ایک انہی طوق و سلاسل کی طرح لگو گیر ہے۔ اور آزادی میں بھی قید کی شان دکھا رہا ہے۔ اس خیال سے انھیں اس کی صورت بُری معلوم ہوتی ہے اور جو ہاتھ دلی بھڑاس نکالنے سے خیال سے گریبان چاک کرنے کو اُٹھتا ہے اس میں اس قید و اسیری کے وہم سے اور زیادہ قوت آجاتی ہے۔

انھیں متواضع و مختلف جہتوں کو پیش نظر رکھ کے غالب مرحوم نے کیا ہی خوب فرمایا ہے۔

ہاے اس چارگرہ کپڑے کی قسمت غالب جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریبان ہونا یہ شعر پڑھنے سے اسی بات کا پورا پورا اطمینان ہوتا ہے کہ غالب کے خیال میں عاشق کا گریبان ایک قابل رشک چیز ہے۔ اور نہ ہی بات دل پر جمتی ہے کہ وہ گریبان عاشق کو نہایت ہی بد نصیب تصور کرتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے اس شعر کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ”اس چارگرہ کپڑے کی جو عاشق کے گریبان میں لگا ہو کیا اچھی قسمت ہے۔“ اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ”ہاے اُس کپڑے کی قسمت کیسی بھوٹ گئی! خیر وہ چارگرہ کپڑا چاہے خوش نصیب ہو یا بد نصیب لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ عجیب چیز جسے جب رفو کر چکے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ پھاڑ ڈالیں۔ اور جب پھاڑ چکے ہیں تو جی میں آتی ہے کہ پھر بیچھ کے رفو کریں۔“

گریبان کی قدر و منزلت کے ثبوت میں ایک مقول شرعی توجیہ بھی کی جاسکتی ہے۔ خداوند جل و علا اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے: ”مَنْ أَقْرَبَ إِلَيْهِ مِنْ جِلِّ الْوَرِيدِ“ جس سے یہ سمجھا گیا کہ ذات باری تعالیٰ رگ گردن کے پاس ہی ہے۔ اسی بنیاد پر عہد قرآن پاک کی آیت ہے۔ ترجمہ یہ کہ ”اُس کے (انسان کے) گلے کی رگ کو اس سے جو قربت حاصل ہے ہم اس سے بھی زیادہ اُس کے قریب ہیں“

آتش مرحوم فرما گئے ہیں۔

یقین ہے اگلے گی جان اپنی آگے گردن میں سنا ہے جا ہے مشرب رگ گلو تیری رگ گلو سے فدائی کی قربت مان لینے کے بعد یہ خیال کیجئے کہ جس ”جل دریدہ“ گلو سے اس حضرت رب العزت کو قربت ہے اُس سے اس خوش نصیب حصہ لباس (گیان) کو سب سے زیادہ قرب اور خاص قسم کا تعلق ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ گریبان ہمیشہ ادبر وقت اُس معشوق حقیقی کے شوق وصال میں رگ گردن کو اپنے سر پر عاشق آغوش میں لیے رہتا ہے۔ اور ایک گھڑی کے لیے بھی اُس سے جدا ہونا نہیں پسند کرتا۔

لیکن یہ توجیہ صرف اس لیے ہے کہ دنیا روتوں کو اُس سے ایک رقم کا دینی اطمینان دلایا جائے۔ یا صافی مشرب صوفی اس پاکباز خیال آرائی کو شن کے وہ بین آجائے۔ مگر اس سے یہ سمجھ نہیں چل ہوتا کہ عاشقوں اور رندان آزاد مشرب گریبان سے اُس ہے یا نفرت۔ دوستی ہے یا دشمنی۔ کیونکہ گریبان کا ذوق جنتیں ہونا۔ و رحمت و عداوت کے دونوں پہلوؤں کو لیے رہنا اس دیندارانہ توجیہ میں بھی موجود ہے۔

یہ پہلا محبت والے کا رخ تو ظاہر ہے کہ گریبان ایک عاشق کی طرح اُس جل دریدہ (رگ گلو) کو اپنے آغوش شوق میں لیے ہوئے ہے۔ اور کسی سراپا جوتی اور موتوں کے ترسے ہوئے عاشق حرام نصیب کی طرح اُسے پھینچ پھینچ کے گلا گاتا اور ایک دم کے لیے بھی سینہ سے جدا نہیں ہونے دیتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس کے محال پہلو پر نفرت ڈالنے والے کو یہ بھی نظر آ رہا ہے کہ مقرب بارگاہ الہی رگ گلو کے حق میں گریبان پھانسی کا پتہ بنا ہوا ہے اور گویا اس کو شش میں ہے کہ اُسے گھونٹ کے رکھ دے۔ اُس کی صورت ہی سے یہ دونوں پہلو نمایاں ہیں۔ وہ ہلال عید بھی ہے۔ اور خنجر بُران بھی۔ وہ کسی نابالغ فرین کی ابروی خم دار بھی ہے۔ اور کسی خاں خوشنوا کی شمشیر آبدار بھی۔

الغرض اس دینی توجیہ کرنے والوں کی صحبت میں بھی اس کے وہ دونوں رخ موجود ہیں جو شعر و سخن اور رند مشربی کے عالم میں نظر آئے تھے۔ لہذا کوئی شکایت کا محل نہیں اگر شعرا کی طرح دوسرے لوگ بھی کبھی اس کی تعریف کریں۔ اور کبھی اسے کو سین۔ کبھی اسے گلے سے لگائیں۔ اور کبھی فوج کے پھینک دیں۔

مامون شید اور مساحت کرہ ارض

مولانا حالی نے اپنے سدس میں جہان مسلمانوں کی علمی ترقیوں کو دکھایا ہے وہاں علم ہیئت کے متعلق اپنے نیک بندہ میں فرماتے ہیں۔

وہ سنجا رکا اور کوئٹہ کا میدان فراہم ہوئے حسین متاح دوران
کرہ کی مساحت کے پھیلائے سامان ہوئی جزد سے قدر کل کی نمایان

زمانہ وہاں آج تک نوحہ گر ہے

کہ عباسیوں کی سبھا وہ کہہ رہے

اگرچہ فٹ نوٹ میں انھوں نے اس واقعہ کا اجمالی ذکر بھی کر دیا ہے۔ مگر اس سے اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ مساحت کس طرح کی گئی تھی۔ اس کی صحبت پر مامون بااؤ لوگوں کو کیونکر اطمینان ہوا تھا اور حسب بیان مولانا حالی۔ جز سے کل کی قدر کیونکر نمایان ہوئی تھی۔ شاید غیر موزون ہو گا اگر ہم دنگد از کے صفحات پر اس واقعہ کو زیادہ توضیح کے ساتھ بتا دیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ علم ہیئت کی اس تحقیق پر جب مامون کی نظر پڑی کہ کرہ زمین کا دور پڑیس ہزار میل کا ہے تو اسے حیرت ہوئی اور کہا بھلا زمین کو کسی نے کیونکر ناپا ہو گا؟ اور اس بات کا بھیج طور پر کیسے پتہ چل سکتا ہے کہ ساری زمین کا دور اتنا ہے۔ علم ہیئت کے سب سے بڑے ماہر اُن دنوں تھوڈ اور احمد۔ اور حسین نام تین بھائی تھے جو موسیٰ بن شاکر کے بیٹے تھے۔ اور علوم ریاضی میں کمال رکھتے تھے۔ مامون نے ان سے پوچھا کہ وہ جو زمین کے دور کی مقدار بتائی جاتی ہے یقینی ہے۔ یا نقطہ وہم وگمان سے کہہ دیا گیا ہے؟ انھوں نے کہا ”یہ بالکل یقینی ہے اور شک و شبہ کو اس میں ذرا بھی گنجائش نہیں“ مامون نے کہا ”اگر یقینی ہے تو مجھے اطمینان دلا دو“ انھوں نے اس کی ذمہ داری کی۔ اور کہا ”ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کون سی سر زمین زیادہ

عہ مولانا حالی نے موسیٰ کے چار بیٹے بتائے ہیں۔ مگر ابو العزا اور ابن خلکان میں ہم نے تین ہی بیٹوں کا ذکر پایا۔ اور غالباً ہی صحیح بھی ہو گا۔

سطح ہے۔ جس میں پہاڑ اور ٹیلے۔ اور زیادہ نشیب و فراز نہ ہوں، چنانچہ مامون کے حکم سے اسکا پتہ لگا کے لوگوں نے بتایا کہ ایسے لن دو دن اور سطح میدان صرف دو جگہ ہیں ایک تو دشت سنجار اور دوسرا صحرا سے کوذ جہان کو سون اور منز لون تک کف دست میدان چلا گیا ہے۔ ان میدانوں کا پتہ لگانے کے بعد تینوں بھائیوں نے مامون کے چند معتد علیہ نذیموں کو ساتھ لیا۔ اور دشت سنجار کی طرف روانہ ہوئے۔

وہاں پہونچ کے ایک جگہ انھوں نے قطب شمالی کی بلندی کو آلات ہندی سے ناپا۔ اور وہاں ایک کیل گاڑ دی۔ پھر اُس کیل میں ایک رستی باندھی اور اسے لیکے ٹھیک شمال کی طرف چلے۔ اور اس کی احتیاط رکھی کہ داہنی بائیں جانب ذرا بھی نہ ہٹیں۔ جب رسی ختم ہو گئی تو ایک اور کیل گاڑ کے رستی اُس میں باندھ دی۔ اور پھر دوسری رستی اُس میں باندھ کے آگے بڑھے۔ جب یہ رسی بھی ختم ہو گئی تو تیسری کیل گاڑ کے تیسری رستی شروع کی۔ اسی طرح برابر کیلین گاڑتے۔ اور رسیوں کو باندھتے اور پھیلاتے کو سون تک چلے گئے۔ اور راستہ میں برابر ناپ کے دیکھتے جاتے تھے کہ قطب کا ارتفاع گھٹا بڑھا تو نہیں۔ یہاں تک کہ ایک مقام پر پہونچ کے پائش کی تو معلوم ہوا کہ قطب کی بلندی ایک درجہ بڑھ گئی۔ یہ دیکھتے ہی وہاں ٹھہر گئے۔ اور یہاں سے وہاں تک جہاں پہلی کیل گاڑی تھی ناپا تو ۶۶ میل کی مسافت چلی۔ اور اندازہ کیا کہ آسمان کا ہر ایک درجہ زمین پر ۶۶ میل کے برابر ہوتا ہے۔ اسکے بعد اُس مقام پر واپس آئے جہاں پہلی کیل گاڑی تھی۔ اور اب اسی طرح کیلین گاڑتے اور رسیاں باندھتے اور پھیلاتے ہوئے سیدھے جنوب کی طرف چلے۔ جس جگہ پر پہونچ کے نظر آیا کہ قطب شمالی کی بلندی ایک درجہ گھٹ گئی وہاں سے ٹھہر کے پوری مسافت کو ناپا تو وہی ۶۶ میل تھی۔

یہ امر پہلے ہی سے ثابت تھا کہ آسمان بارہ برجوں پر اور ہر برج ۳۰ درجوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ لہذا آسمان کا پورا دور ۳۶۰ درجوں کا ہے اور اُس کے مقابل زمین پر جب ہر درجہ کے معافی ۶۶ میل کی مسافت ثابت ہوئی تو ۳۶۰ کو ۶۶ میل سے ضرب دینے سے ثابت ہو گیا کہ زمین کا پورا دور جو بیس ہزار میل کا ہے۔ جب ان تینوں بھائیوں نے سنجار سے واپس آ کے یہ کیفیت مامون سے

بیان کی تو وہ بہت خوش ہوا اور کہا "مثیک اس سے اطمینان ہو جاتا ہے مگر مزید اطمینان کے لیے ضرور ہے کہ کسی اور جگہ بھی اس کی آزمائش کی جائے۔ چنانچہ اب یہ تینوں بھائی بغداد سے کوخذ کو روانہ ہوئے۔ اور وہاں کے صحرائے قی و دق میں بھی اسی طریقہ سے کیلین کاڑ کاڑ کے اور ان میں رسیان باندھ باندھ کے پتہ لگایا کہ ہر درجہ فلک کی مسافت زمین پر ۶۶ ۲/۳ میل کی ہے۔

یہ کیفیت علامہ بن خلکان نے بیان کی ہے۔ مگر ابو الفداء نے اس پورے واقعہ کو نقل کر کے لکھا ہے کہ ابن خلکان اور دیگر مورخین نے جو یہ لکھ دیا کہ مامون کے عہد کی تحقیقات سے ہر درجہ فلک کی مسافت زمین پر ۶۶ ۲/۳ میل ثابت ہوئی تھی غلط ہے یہ یونانیوں کی قدیم تحقیقات تھی۔ مامون کے حکم سے جب اس کے عہد کے ہندوؤں نے پیمائش کی تو ہر درجہ فلک زمین کے ۵۶ میل کے مساوی ثابت ہوا۔ جو امر کہ ازمنہ مابعد میں محقق اور طے شدہ تسلیم کر لیا گیا۔

شہر پارموکا و خمہ

پارمو جزیرہ صقلیہ (سسیلی) کا مستقر حکومت اور دار السلطنت ہے۔ اس جزیرے پر کبھی مسلمانوں کا قبضہ تھا اور اس کے ہر گلی کوچے میں دن بھر میں پانچ بار توحید کا نعرہ اللہ اکبر بلند ہوا کرتا تھا۔ جس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ جب ابن مجیر اندلسی اپنے سفر حج کے وقت اس جزیرے میں ہو کے گذر اتوا سے ہر قدم پر مسجدین نظر آئیں۔ مسلمان کثرت سے یہاں آباد ہو گئے تھے۔ اور صد با عربی خاندانوں نے اس جزیرے کو اپنا موطن و مسکن بنا لیا تھا۔ انقلاب زمانہ سے چند روز بعد پھر مسیحیت کا غلبہ ہوا۔ اور عنان حکومت عیسائیوں کے ہاتھ میں گئی۔ جو ساری دنیا کو متعصب بنا کے اپنی بے تعصبی کے قصائد خود ہی پڑھتے اور خود ہی داد دے لیا کرتے ہیں۔ اور تمام دیگر مذاہب کو ان ٹالریٹ (غیر بردبار) بتا کے اپنے ٹالریٹ (بردباری) کی طرح سرائی کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ تجربہ یہ بتا رہا ہے کہ اگلے دنوں ان سے زیادہ غیر بردبار کوئی قوم نہ تھی۔ چنانچہ صقلیہ میں بھی عیسائیوں کا عمل ہوتے ہی ساری سرزمین

موجود خدا پرستوں سے خالی ہو گئی۔ جن مسجدوں سے اذان کی آواز بلند ہوا کرتی تھی آج بھی موجود ہیں مگر خاموش سنان اور قریب الاندام۔ سباحون کو آج بھی شہر پاراموین جو چیز قابل توجہ نظر آتی ہے، وہ اسلامی عمارتوں کے کھنڈر اور ان کے حربی کتبہ ہیں۔

مگر مسیحیت نے بھی بیان دو نہایت ہی انوکھی عبرت ناک اور قابل دید چیزیں قائم کر دی ہیں۔ ایک تو بیان کا پاگلخانہ۔ جو ساری دنیا کے پاگل خانوں میں ممتاز بتایا جاتا ہے۔ اور دوسرا بیان کا دخمہ۔ جس کی کیفیت بیان کرنے کے لیے ہم نے اس وقت قلم ہاتھ میں لیا ہے۔

دخمہ دراصل اُس محصور مقام کو کہتے ہیں جس میں انسانوں کی لاشیں لے جا کے رکھی جاتی ہوں۔ دخمہ کا رواج عموماً پارسیوں یعنی مذہب زرتشت کے پیروں میں ہے۔ جن کے دخمہ ہندوستان کے اکثر شہروں اور خاصہ ممبئی میں موجود ہیں۔ ان کا دخمہ ایک مضبوط اور بہت بلند دیوار کا مدور احاطہ ہوتا ہے۔ جس کے بیچوں بیچ میں ایک کٹوان ہوتا ہے۔ اور اُس کے گرد کی ڈھالوں میں پر قبر ناپست چوڑوں کا ایک یا کئی حلقہ ہوتے ہیں۔ اور انھیں چوڑوں پر لاشیں لے جا کے رکھ دی جاتی ہیں۔ جن کو اگر مردار خوار طیور پہنچ گئے تو نوچ کے کھا جاتے ہیں۔ ورنہ شرتی یا مدتوں تک پڑی سوکھا کرتی ہیں۔ اور خشک اور برہنہ ہڈیاں ایک مدت کے بعد اسی درمیانی کنوین میں ڈال دی جاتی ہیں۔ پارسیوں کے دخمے کے اندر سوا ان خاص لوگوں کے جو دخمہ داری کے انجام دہین اور کوئی شخص چاہے کیسی ہی کوشش کرے اور کتنا ہی بڑا مغرور و صاحب اثر ہو نہیں جاسکتا۔ اور حقیقت وہ جانے کے قابل مقام بھی نہیں ہے۔

لیکن پاراموکی مسیحی دخمہ بالکل مختلف چیز ہے۔ یہ ایک عظیم الشان سرداب یا تہ خانہ ہے جس میں ہر قسم کے مقدسوں اور مغروروں کی لاشیں محفوظ رکھی جاتی ہیں۔ اور سباحون کو اسکی سیر کا موقع بھی مل سکتا ہے۔ قرون وسطیٰ میں مسیحیوں میں جب صلیب پرستی کا جوش ہوا تو اصلی صلیب کے نام سے لکڑی کے صد ہا کمرے جو مقدس مقتداؤں کی معرفت دستیاب ہوئے ہر شہر اور ہر قریہ میں بچنے لگے۔ اور ایسی کے ساتھ یہ خیال

بھی پیدا ہوا کہ مقدس و محترم لوگوں اور دین کی حمایت میں جان دینے والے شہیدوں کی ہڈیاں ذریعہ برکت سمجھ کے عظیم و مکرم سے محفوظ رکھی جائیں۔ اور آخرین صلیب کی طرح اُن ہڈیوں کی بھی ہر جگہ پرستش ہونے لگی۔ اس ذوق نے اکثر جگہ اور خاصہ روم الکبریٰ اور اٹلی میں مقدسایان دین کی ہڈیوں کے ڈھانچوں۔ اور بزرگانِ سلف کے عظامِ رمیم کے بہت سے خزانے قائم کرا دیے۔ جو آج تک موجود ہیں۔ اور اُن میں بہت سے بڑے مشہور اجیون اور شہیدوں کی ہڈیاں محفوظ ہیں۔

غالباً بزرگوں کی ہڈیوں کے بہ طور تبرک محفوظ رکھنے کے خیال ہی نے پالرمو کا یہ دخمہ قائم کرا دیا ہے۔ جس میں آج تک ناموران قوم اور مقدس لوگوں کی لاشیں لے جا کے حفاظت سے رکھی جاتی ہیں۔ لنڈن کے وِسٹ منسٹر ایسی میں ناموران قوم کی ہڈیاں زیر زمین دفن ہیں۔ اور سیاح کو صرف اُن کی قبریں اور مورتیں نظر آ سکتی ہیں۔ مگر یہاں پالرمو کے دخمے میں انسان خود اُن کے پوست و استخوان کو عبرت و معویت کی نگاہوں سے دیکھتا۔ اور ایک دفعہ سیر کر لینے کے بعد مہینوں تک خواب میں چونک چونک اُٹھا کرتا ہے۔ لیکن اُسکے معائنہ سے چاہے دل پر ایک ہیبت ناک اثر پڑے مگر یہیں امید ہے کہ اُس کا بیان دیکھنے سے خالی نہ ہوگا۔

یہ دخمہ ایک عظیم الشان خانقاہ کے متعلق ہے جو ”مانسٹری آف دی کاپشنس“ کہلاتی ہے۔ آپ جیسے ہی یہاں پہنچیں گے چند راہب جن کی سفید ڈاڑھیوں۔ اور ٹاٹ کے لمبے لمبے جُتوں پر ایک بڑا تقدس برس رہا ہوگا آپ کو اخلاق و فروتنی کے ساتھ ہاتھوں ہاتھوں لیں گے۔ اس خانقاہ والوں کی عام وضع کے مطابق انکی کمر بنیں رسیاں بندھی ہوگی۔ وہ آپ کو لیجا کے عبادت گاہوں اور ریاضت کرنے کے حجر و کئی سیر کریں گے۔ اور اگر آپ نے خواہش کی تو دخمہ یعنی استخوان ہائے رمیم کے خزانہ عظیم کی بھی سیر کر دیں گے۔ سرداب اور تہ خانے کا دروازہ کھلتے ہی آپ کو ایک طولانی زینہ لٹے گا جو تین گنبدوں کے نیچے بڑے بڑے رواقوں کے اندر ہی اندر دوڑ تک چلا گیا ہے۔ ان تینوں رواقوں کے بلند ترین حصوں میں تین کھڑکیاں روشن دالون کی وضع سے کھلی ہوئی ہیں۔ اور اُن سے یہاں کی خموشی میں ایک دھندلی روشنی پہنچتی رہتی ہے۔ یہ ایک ایسا مہیب منظر ہے کہ انسان کو اس سے پہلے دنیا میں کہیں نہ نظر آیا

ہوگا۔ دونوں جانب دیواروں میں پتلے پتلے برکیٹوں کی قطاریں چلی گئی ہیں جن میں
 راہبوں کی خشک لاشیں اپنے مقتدرائی کے لباس میں لمبے لمبے سجے پہنے لٹک رہی ہیں
 یہ لاشیں آگے کی طرف جھکی ہوئی ہیں اور دیکھنے والوں کے دل پر اُن کی اس وضع سے
 یہ دہشت طاری ہوتی ہے کہ کمین ایسا نو یہ ہم پر اُڑیں۔ اُن کے ہاتھ یا تو صلیبی
 وضع سے سینے پر رکھے ہوئے ہیں یا دونوں پہلوؤں پر لٹک رہے ہیں۔ اُن کے
 چہرے امتداد زمانہ سے سیاہ اور سوکھ کے کھنکر ہو گئے ہیں۔ اور ان کی بگڑی صورتوں
 سے کسی تقدس کا اثر پڑنے کے بجائے انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم بھوتوں
 کے نرغے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ خشک اور روکھے بال جن کی رنگت زیادہ پھوری ہو گئی
 ہے خاک آلود کھوپڑیوں پر لگے ہوئے ہیں۔ منہ کھلے ہوئے ہیں۔ اور دانت (کجی لاش
 میں پورے ہیں کسی میں کم ہیں اور کسی میں نہیں ہیں اور امتداد زمانہ سے میلے ہو گئے ہیں)
 نکلے ہوئے ہیں۔ ناکین سکر کے رہ گئی ہیں۔ اور نہایت کچھے ہوئے گال جا بجا سے چٹخ
 گئے ہیں۔ اور ان سب کی مجموعی حالت سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سچان لاشیں نہیں
 بلکہ ایسے جاندار ہیں جن پر طاعون کا عذاب نازل ہوا ہے۔ ہر ایک کے دامن میں
 ایک کاغذ کا پُرزا البین سے اٹکایا ہوا ہے جس میں اُس کا نام۔ عمر۔ اور تاریخ
 وفات لکھی ہوئی ہے۔

سیچے زمین پر ایسے صندوق کی تین چار قطاریں چلی گئی ہیں جن پر مٹے مٹے
 نقش و نگار بنے ہوئے ہیں ان صندوقوں میں امراء صقلیہ کی لاشیں بند ہیں۔ ایک لمبے
 مچان پر تقریباً سو پچھپچھ جن کی عمریں ایک سال سے پانچ سال تک کی ہوں گی نہایت ہی
 زرق برق لباس پہنے ننھی ننھی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اُن کی کرسیاں وہی ہیں جنہر
 وہ اپنی زندگی میں بیٹھتے یا بٹھائے جاتے تھے۔ اُن کے سروں پر خوشکی سے سیاہ پُرسے
 ہیں نہایت ہی پر تکلف ٹوپیاں ہیں۔ اور ہاتھوں میں کھلونے۔ اور دو ایک بچوں کے
 ساتھ یہ تکلف بھی کیا گیا ہے کہ کوئی بھڑا ہوا کتا۔ یا تو تا۔ اُن کی گود میں بٹھا دیا
 گیا ہے۔ اس سے زیادہ بھیاں ایک مضحکہ خیزی کا کرشمہ دنیا بھر میں شاید کمین نہ
 نظر آئے گا کہ ایسے ننھے ننھے بچے ہیں جن کا لباس تو بہت ہی زرق برق ہے مگر چہرے
 مڑجھا کے سوکھ گئے ہیں جنہیں اُس لباس سے کوئی نسبت نہیں۔ ان بچوں میں سننے

ایک کا ایک ہاتھ دُوری سے باندھ کے اونچا کر دیا گیا ہے۔ جس میں کوڑا ہے اور گویا بچپن کے کھیل میں وہ کوڑا پھٹکار رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی گھٹنا اور گلا ہوا سر لٹک کے سینہ پر تگ گیا ہے۔ چڑے کی خوبصورت ٹوپی سر سے اتر کے الگ جا پڑی ہے۔ اور بے باکوں سفید سفید چند ایکھل گئی ہے۔

اس قسم کے کئی گلیارے چلے گئے ہیں۔ جن میں امریکی لاشوں کے تابوتوں پر راہبوں اور پاروں کی لاشیں اپنے تھس مانی کے کپڑے پہنے ہوئے کھڑی ہیں۔ اور مچائون پر چھوٹے چھوٹے بچے نئی نئی ترتیبوں سے بٹھائے گئے ہیں۔

اس دھرمین مقدادوں اور سب طرح کے لوگوں کی کچھ اوپر تین ہزار لاشیں لٹکی ہیں جنہیں سے چند بہت ہی پرانی ہیں۔ ان میں سے ایک ڈیڑھ سو برس سے زیادہ پرانی ہے جسکی زبان جو سوکھ کے کاٹا ہو گئی ہے باہر نکل پڑی ہے۔ اُسے پکڑ کے ہائے تو معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی سوکھی ہوئی مچھلی یا نہایت ہی سخت اور چمڑا ناخن ہے۔

آخری گلیارے کے آخر میں ایک اور رواق نظر آتا ہے جو عورتوں کی لاشوں کے لیے مخصوص ہے۔ ایک شخص کو جس نے قیس چالیس برس ہوئے اس دھم کی سیر کی تھی ایسی عورتوں کی لاشیں نظر آئیں جنکو مرے ایک ہی سال ہوا تھا۔ یہ سفید تو شکون کے اوپر تکیوں پر سر رکھے مختلف وضو میں لیٹی ہوئی آرام کر رہی تھیں۔ انہیں میں ایک بہت ہی نوعمر بالرمو کے ایک مغز گھرانے کی لڑکی تھی جس کی نسبت کاغذ کے پُڑے میں لکھا تھا کہ ”سترہ برس کی عمر میں کنواری دنیا سے رخصت ہوئی“ جو راہب اُسے اس دھم کی زیارت کر رہا تھا اُس نے بتایا کہ ”یہ دو بہنیں تھیں جو توام پیدا ہوئیں۔ ایک تو یہ ہے اور دوسری اس زمانہ میں شہر پارمو کی حسین ترین عورت سمجھی جاتی ہے۔ جس کا حسن و جمال میں دُور دور تک جواب نہیں۔ یہ نوعمر حسینہ ایک چھوٹے تخت پر جو تاروں میں بندھا ہوا ہے چٹ لیٹی تھی۔ سفید کپڑے زیب بدن تھے۔ اور مصنوعی پھولوں کا ایک بڑا گلہ ستہ اُس کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔ اُس کا چہرہ اور ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔ اور گوزم جلد پر خشک ہونے کا گمان نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر چھوٹی سیاہ چونٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ ستاح نے اُس کے تختے پر لکڑی ماری۔ اور اس تحریک کے ساتھ ہی منہ اور نٹھنوں سے

صد با چوٹیاں گل پُرس، افسوس! جس حُسن و جمال کے عشق میں ہم اپنی جانیں نذر کر دیا کرتے ہیں اُس کا یہ انجام کس قدر عبرت ناک اور دکھناش ہے!

اُسی ستیاج کا بیان ہے کہ واپسی میں جب ہم زینے کی طرف چلے تو زیارت کر نیا لے راہب نے ہمیں نیچے والے مچان کو دکھا کے بتایا کہ جو نئی لافین آتی ہیں وہ ابتداً رچہ ہیندہ تک اسی پر رکھی رہتی ہیں۔ اور ہفتہ دو ہفتہ تک اُن کی تعفن کسی طرح برداشت نہیں کی جاسکتی۔ اُن کے خشک کرنے کے تدابیر کیے جاتے ہیں۔ اور جب بالکل خشک ہولیتی ہیں تو درجے۔ حالت۔ اور ذات کے لحاظ سے اپنے مقام پہنچا دی جاتی ہیں۔

رستی کی ایک الگنی اُن گلیاں رون کے بچوں بیچ میں چاروں طرف بندھتی چلی گئی ہے۔ راہبوں اور مقتداؤں کی لاشیں اُس میں باندھ کے تختہ پر کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ اور جب تک اُن کی ٹہیاں گل کے جذبات نہ ہو جائیں وہیں کھڑی رہتی ہیں بعض اوقات یہ لاشیں سو برس تک کھڑی رہتی ہیں۔

اس ستیاج کا یہ بھی بیان ہے کہ جب ہم سیر کر کے زینہ کے اوپر چڑھ آئے اور زیارت کرانے والے راہبوں کا شکر یہ ادا کر کے رخصت ہونے کو تھے کہ چند اور راہب ایک بوچھ کو کندھے پر اٹھائے ہوئے لے آئے جس کی کھڑکیاں بند تھیں۔ زیارت کرانے والا راہب ہمیں واپس بلا کے اُس بوچھے کے پاس لے گیا۔ اور اُس کی کھڑکی کھول دی۔ ہمیں اس کے اندر ایک سفید بالون والی بوڑھی عورت کی لاش نظر آئی جو اُس کے اندر پشت کی جانب دو کڑیوں میں رسیوں سے باندھ کے بٹھا دی گئی تھی۔ رسی کا ایک پھندا اُس کے سینہ کے پاس تھا۔ اور دوسرا اُس کے گلے میں۔ اسی دن صبح کے وقت اُس کا دم نکلا تھا۔ اور بیان اس لیے لائی گئی تھی کہ سکھا کے اس دھم میں رکھی جائے۔ اُس کو نہایت پُر تکلف ریشمی کپڑے پہنائے گئے تھے۔ اور سر پر ایک عمدہ ٹوپی تھی۔ جس لباس میں ایک بوڑھیا کی لاش دیکھ کے دل پر عجیب قسم کا اثر پڑتا تھا۔

عہ بدگامی کی قسم کی ایک سواری جس میں فتن کی طرح آگے پیچھے دو بانس لگے ہوتے ہیں۔ اور اُسے کمار اٹھا کے لے چلتے ہیں۔

اس دمجہ کی کیفیت سننے سے معلوم ہوتا ہے کہ محی بنانے اور لاشون کے محفوظ رکھنے کا پُرانا طریقہ جس کا فراعہ مصر میں رواج تھا مصر قدیم کے لوگوں پر ختم نہیں ہو گیا بلکہ مسیحیوں کی استخوان پرستی کی بدولت آج تک جاری ہے۔ اور اب بھی بہت سی لاشیں مختلف تدابیر سے خشک کر کے محفوظ رکھی جاتی ہیں۔

نئی اشاعتوں پر ریویو

مسدس حالی۔ (مدو جز اسلام، مصنفہ شمس العلماء مولانا حالی۔ اس مسدس نے حبیبی تقبیل حاصل کی۔ اور مسلمانوں پر اس کا جیسا اثر ہوا مختلف بیان نہیں۔ اسی نظم اور اسی قومی مرثیہ میں یہ خوبی ہے کہ دوسو دفعہ پڑھ جائیے اور جی ہی چاہتا ہے کہ پھر پڑھیے طبیعت نہیں سیر ہو گئی۔ اس کی سحرنا مقبولیت عامہ کا آخری نمونہ یہ ہے کہ مولوی رحمۃ اللہ صاحب نقد نے جو فن طبع کے مسلم الثبوت اور بے بدل استاد مانے جاتے ہیں اپنے چھپائی کے کمالات دکھانے کیلئے اسے منتخب کیا۔ اور ایک پاکٹ ایڈیشن شائع کیا ہے۔ جسکا پایا نہ انگریزی درسی کتبوں کی طرح چھوٹا اور نہایت خوبصورت ہے۔ لوح کی سادی خوشنما بیل میں سرخ لاجوردی اور طلائی رنگوں سے سادی میں بناوٹ اور بناوٹ میں سادگی کی شان پیدا کی گئی ہے۔ کاغذ نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا دلائی گندہ اور چکنا لکایا گیا ہے۔ نہرت کے بعد اول میں مولانا حالی کی تصویر ہے۔ جس سے متانت۔ تہذیب اور غور و خوض کے جذبات ظاہر ہو رہے ہیں مسدس میں اکثر جگہ تاریخ اسلام کے سلسلہ میں مختلف بلا و امصار کے نام آگئے ہیں جو اجل کے نقطن میں نہیں ملتے۔ اور جن سے آج کل کے جغرافیہ دان غیر مانوس رہتے ہیں۔ اس شواہی کے دور کر نیکی لیے حضرت سعد نے تین قدم نقشہ بڑے اہتمام سے تیار کر کے اضافہ کیے ہیں۔ ایک عرب کا جسکی پیشانی پر لکھا ہے ”عرب اور کل کائنات اسکی یہ تھی“ دوسرا عہد ترقی اسلام کی دنیا کے غالب صہم کا۔ جس کا عنوان ہے ”عرب، ہند، مصر، اندلس، شام، و ولیم، قیسر اندلس کا جسکا ماٹو یہ ہے ”ہو اندلس ان سے گلزار کمیر“ ان کے علاوہ ایک نقشہ فارحرا۔ اور اس سے ماہتاب نبوت کے طلوع کرنے کا ہے۔ جس پر لکھا ہے ”کیا چاند نے کھیت فارحرا سے“ اس آخری نقشہ میں جناب سعد نے شاعرانہ مصوری کا کمال دکھا دیا ہے۔ آخر میں مولانا

حالی کا قصیدہ غیاثیہ ہے۔ اس پبلک ایڈیشن کی ضخامت ۱۶۷ صفحوں کی ہے۔ اور جلد بھی انگریزی مذاق کی نہایت ہی خوبصورت جسکی پہلی دفعتی پرنٹنگ انگریزی حرفوں میں لکھا ہے "مسدس حالی اردو" خلاصہ یہ کہ اس سے زیادہ خوشنما اور دلکش۔ مسدس حالی کیا معنی اردو کی اور کوئی کتاب بھی کم نظر آئے گی۔ اور اس کے ساتھ قیمت کچھ نہیں صرف ۷۰ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اسکو ایک جلد منگوا کے اپنے پاس احتیاط سے رکھے۔ مہذب لوگوں اور تعلیم یافتہ خاندانوں کو چاہیے کہ بجائے یہودہ کھلونوں کے یہی مسدس منگوا کے اپنے بچوں کو دین۔ جو آئینہ عبرت ہونے کے ساتھ نہایت ہی خوشنما اور نظر فریب کھلونے کا کام دے سکتا ہو۔ درخواستیں "کانپور۔ نامی پریس" کے پتہ پر مولوی رحمت اللہ صاحب رعہ کی خدمت میں بھیجی جائیں۔

ادیب۔ اس سال کے برکات میں ماہوار رسالہ ادیب ہے۔ جو نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ انڈین پریس الہ آباد سے ہمارے دوست منشی فوٹ رائے صاحب نظر سابق ایڈیٹر خدنگ نظر کے اہتمام سے شایع ہونا شروع ہوا ہے۔ یہ رسالہ مختلف حیثیتوں سے اردو کے تمام رسالوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ حضرت نظر کو اعلیٰ ذوق لٹریچر کے ساتھ چھپائی اور مصوری کے فنون میں بہت کچھ دخل ہے۔ چنانچہ اس رسالہ کی چھپائی کاغذ اور سب چیزیں اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ مگر بہتر ہو کہ ہمارے دوست کاتب کو بدل دیں۔ اور اردو کے مشہور انشاپروازوں کو اس رسالہ کی طرف ابھی پوری توجہ نہیں ہوئی ہے۔ تاہم بعض مضامین اچھے ہیں جو محنت قابلیت اور تلاش سے لکھے گئے ہیں۔ ادیب کو خاص ذوقیت اس کی تصویروں کے اعتبار سے ہے اور ہمیں یقین ہے کہ کوئی رسالہ اور کوئی مطبع اس بارہ خاص میں ادیب اور انڈین پریس کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ ہم نے خود جا کے انڈین پریس کو دیکھا جس میں ہر کام اعلیٰ چاہیہ پر ہوتا ہے۔ خصوصاً تصویروں کے چھاپنے کا انتظام تو شاید ملندی سہند کے کسی پریس میں دیا نہ ہو گا جیسا کہ انڈین پریس میں موجود ہے۔ اس وقت تک ادیب کے تین نمبر شائع ہو چکے ہیں جن میں ہر ایک دوسرے سے زیادہ دل فریب و دلکش تھا۔ پہلے اور دوسرے نمبروں میں چھ چھ تصویریں تھیں۔ تیسرے نمبر میں نو تصویریں شایع ہوئیں۔ اور ہمیں امید ہے کہ چوتھے نمبر میں اس سے

بھی زیادہ ہون گی۔ آدیب کا پیمانہ بھی عام رسالوں سے جدا اور خاص وضع کا ہے۔ جو طوں میں ۲۰+۲۶ کے برابر اور عرض میں بہت زیادہ ہے۔ اور ان سب خوبیوں کے ساتھ سالانہ قیمت صرف للہ (چار روپیہ) ہے۔ اور فی پرچہ ۶ ارادو زبان کے شائقین کو ضرور خریدنا چاہیے۔ کیونکہ انگریزی کے سوا اردو میں کوئی رسالہ اس آب و تاب اور اس شان کا آج تک نہیں شائع ہوا تھا۔ در خواستیں۔

منہجِ ادیب - انڈین پریس الہ آباد کے پتہ پر بھی جائیں

دیوانِ وحشت مولوی رضا علی صاحبِ حشت کا اردو فارسی کلام۔ حضرت وحشت کی طبیعت شاعری کے لیے بہت مناسب ذائقہ ہوئی ہے۔ کلام میں خاص رنگ اور خاص لطف ہے۔ پُرانے مذاق کے نبھانے کے ساتھ جدید رنگ کی شوخیان اور دھچک بیان بھی پیدا کرنا حضرت وحشت کا خاص رنگ ہے۔ مذاق سخن کا اندازہ کرانے کے لیے بغیر کسی انتخاب کے ہم اُن کی ایک غزل کے چند شعر پیش کیے دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

پرایا مال لیکر آپ نے کی سیسختی ابھی
عیادت کے لیے بیجا ہر سب سے پاس دشمن کو
نہ الفت و ستون سے ہر نہ دشمن سے عداوت ہر
بلا تقصیر مجھ سے کھینچ گئے یہ بانگین اچھا
یہ مانا ذکر دشمن کچھ محبت سے نہ تھا لیکن
چلا ہے سمت کعبہ تنکدے کو چھوڑ کر وحشت
بہمن یقین ہے کہ نقادان سخن اس دیوان کو ملاحظہ کر کے خوش ہونگے۔ چھپائی
لکھائی اور کاغذ سب چیزیں اچھی ہیں۔ اور ضخامت ۱۴۸ صفحات کی ہے۔ قیمت
فی جلد ایک روپیہ۔ درخواستیں مصنف صاحب کے نام (نمبر ۱۸) یہ روڈ۔ ڈاک خانہ
بالی گنج کلکتہ (پتہ پر جائیں۔

حصہ اول و دوم - شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کی جدید اور تازہ تصنیف جس میں

فارسی شاعری کی ابتداء اسکی عہد بعد تر قیوں۔ اور ان کے خصوصیات و اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ مشاہیر شعرے سلف کے تفصیلی حالات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اور ان کی شاعری پر تقریظانہ تنقید ہے۔ قیمت حسب ذیل ہے۔

حصہ اول	غیر مجلد	۷۰
حصہ اول	مجلد	۷۰
حصہ دوم	غیر مجلد	۷۰
حصہ دوم	مجلد	۷۰

جو صاحب منگوانا چاہیں ”ذقتر وہ العلیا۔ لکھنؤ“ کے پتہ پر شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی سے مراسلت کر کے طلب فرمائیں۔

قدر افزایان دگلدار

آپکی توجہ و عنایت سے دگلدار کی اشاعت برپا ہو رہی ہے۔ اور ہم کو یقین ہے کہ اگر چند روز بھی جناب کی ایسی ہی توجہ قائم رہی تو ذقتر دگلدار آپ کی خدمت میں نہایت اعلیٰ درجہ کا لٹریچر دیکھپ اور مفید ناول اور متعادل کتب تاریخ، پیش کر سکے گا۔ اس کوشش میں ہم ہمہ تن مصروف ہیں۔ اور عنقریب اپنی ان فیاضانہ کوششوں کے معاوضہ میں آپ ہمارے حسن خدمت کو بھی ملاحظہ فرمائیں گے۔ اب پرچہ انشاء اللہ استقلال سے نکلیں گے۔ اور وقت پر پھیلے گا۔ سابق کے خریداروں کو توجہ فرما کے منسلک کا حساب بمباق فرمادینا چاہیے۔ ہم نے اب یہ بھی ارادہ کر لیا ہے کہ اختتام سال پر ایک عمدہ ناول مفت خریداران دگلدار کی انڈر کرینگے۔ اور اسکی بابت کوئی زائد رقم نہ لی جائے گی۔ مگر ان سب خیالات کا دار و مدار اسی پر ہے کہ ہمارے قدر دان اپنے احباب کو بھی دگلدار کی قدر افزائی پر آمادہ فرماتے رہیں۔ کیونکہ صرف کثرت اشاعت حوصلہ افزائی کر سکتی ہے۔

خاکسار۔ منیجر دگلدار



جو مغزو و محرق اور واجب التفطیم نام مسلمانوں کے اثر سے ہندوستان کے عام لڑکچر اور خافتار رو کی دینا میں آئے ہیں ان میں بہت ہی با وقعت نام حضرت لقمان کا ہے۔ یہ نام علمی دنیا ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ زبان زد خاص عام ہو گیا۔ ہر شخص جب کسی کو بہت ہی برا عقلمند تسلیم کرتا ہے تو اسے لقمان مانہ کہتا ہے۔ اور جب کوئی کسی کے علمی عوڈن پر تعویض کرتا ہے تو کہتا ہے کہ آپ ہی تو اپنے وقت کے بڑے لقمان ہیں۔

حضرت لقمان کو دیگر عقلا کے مقابلے میں یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ ان کا نام قرآن پاک میں آگیا ہے اور خود حضرت جل و علانے بھی لقمان کی حکمت و دانائی کا اعتراف کیا ہے۔ اسی وجہ سے اسلام کے علمائے سلف میں اختلاف پڑا ہوا ہے کہ لقمان پیغمبر تھے۔ یا صرف ایک عابد و زاہد حکیم۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ پیغمبر نہ تھے کیونکہ نہ خدا تعالیٰ ہی نے ان کو پیغمبر بنایا ہے اور نہ کسی ایسی قوم کا پتر چلتا ہے جسکی ہدایت اور اس میں توحید کی تبلیغ کرنے کے لیے وہ مبعوث ہوئے ہوں۔ چنانچہ انھیں امور کے خیال سے علما کا غالب گروہ انھیں ایک حکیم و دانایا اور سلف کا مدد و صلح ہی بتاتا ہے۔

مگر یہ تھوڑی حیرت کی بات نہیں کہ ایسا نامی گرامی شخص جو دینی و دنیوی دونوں حیثیتوں سے محترم مانا جاتا ہو جبکی دانائی و حکمت کی چار دانگ عالم میں دھوم ہو جب کا نام ہر اونے و اعلیٰ کی زبان پر ہو۔ اس کے حالات سے بہت ہی کم لوگ واقف ہیں۔ اور یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کون تھے؟ کب تھے؟ کہاں تھے؟ پور کیا کرتے تھے؟

ان کا نام و نسب لقمان بن قاعور بن ناخور بن ناریخ بتایا گیا ہے۔ تاریخ حضرت ابراہیم کے والد اذکر کا لقب یا نام تھا جس سے گمان ہوتا ہے کہ وہ حضرت ابراہیم کے ہم نسب

ہوں گے۔ مگر یقیناً غلط ہے۔ کیونکہ لقمان ارض سودان کے رہنے والے حبشی نژاد تھے۔ اور انکے سلسلہ نسب کے بنی اسرائیل کے سلسلہ میں ملنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بعض دیگر روایتوں میں لقمان کے باپ دادا کا نام عسقا و بن مردن بتایا گیا ہے۔ اور کیا عجب کہ یہی صحیح ہو۔ علم اسلام میں سے بعض لقمان کے نام کو عربی الاصل بتاتے ہیں جبکہ نزدیک اُس کا مادہ لغم ہے۔ اور بعض غمی۔ مگر وہ لوگ غلطی پر ہیں جو لفظ لقمان کو عربی خیال کرتے ہیں۔ جب خود لقمان عرب کے نہ تھے تو ان کے نام کے عربی الاصل ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

اصل میں حضرت لقمان ایک حبشی غلام اور شکل و صورت میں نہایت ہی حقیر و ذلیل اور پستہ قامت تھے۔ سطح حبشی غلام عموماً سر زمین نوبہ اور سودان سے لائے جاتے ہیں وہ بھی لائے گئے تھے۔ ناک جیشیوں کی طرح میٹھی ہوئی اور چبھتی تھی۔ ہونٹھ موٹے اور بڑے بڑے تھے۔ پاؤں کے تلوے سیاہ تھے یعنی نشید فرار ہونے کے باعث پورا پاؤں زمین پر پیٹھا جاتا تھا جیسے پاؤں عموماً جیشیوں کے ہو کرتے ہیں۔ بڑی کام کرتے تھے بعض لوگ کہتے ہیں کہ زری کا کام کرتے تھے اور بعض آئین چرواہا بتاتے ہیں۔ مگر ممکن ہے کہ مختلف اوقات میں انھوں نے سب کام کیے ہوں۔ انکے زمانے کے متعلق صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ حضرت داؤد کے عہد میں موجود تھے۔ جناب داؤد کے ہاتھوں میں عتبان حکومت کے آنے سے پہلے بنی اسرائیل میں فتوے دیا کرتے تھے۔ اس لئے کہ باوجود غلام حبشی ہونے کے علم و فضل نے انکو قوم بنی اسرائیل کا مفتی بنا دیا تھا۔ بعض علماء سلف کہتے ہیں کہ انھوں نے علم و فضل حضرت ایوب بی سے حاصل کیا تھا۔ اور انھیں کے بھانجے تھے۔ چونکہ انکا حبشی نژاد ہونا پایہ اعتبار کو پہنچا ہوا ہے اسلئے حضرت ایوب کی شاگردی میں توشبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں مگر انکا بھانجا ہونا ہرگز قابل اعتبار نہیں ہے۔

حبشی غلاموں کو دنیا کی ہر قوم ذلیل و حقیر خیال کرتی ہے۔ اسلام سے پہلے جبکہ غلاموں کے ساتھ بہت ہی بے رحمی اور بیعت کا سلوک کیا جاتا تھا ان غریبوں کی ہر ملک میں نہایت ہی بے قدری تھی۔ مگر ان غلاموں میں لقمان کے ایسے حکم و انانکا ہونا ایک ایسی بات تھی جس سے اُن سیاہ فام غلاموں کی عزت اور قدر و منزلت بڑھ گئی۔ چنانچہ حضرت سرور کائنات علیہ السلام پر وہاں دین اسلام کو ہدایت و نصیحت فرماتے ہیں حبشیوں کو تم اپنی سوسائٹی میں لو اسلئے کہ میں حبشی لقمان بنی اسرائیل اور بلال حبش کے سرداروں میں ہیں۔

سعد بن مسیب نے ایک حبشی کو ملوں و دل شکستہ دیکھ کے تسلی دی اور فرمایا اپنے سیاہ فام

ہونے پر تمہا فوس نہ کرو۔ کیونکہ تمہارے ہی گروہ میں لقمان تھے۔ بلال تھے۔ اور حضرت فاروق کے غلام بیچے تھے۔ جنیک نفس اقصیٰ زمانہ میں تھے۔ اور بہترین لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔
 لقمان اگرچہ اعلیٰ ترین حکما اور دانائوں میں تھے۔ مگر اس قدر گمنامی کے زمانے میں تھے کہ انکی تعلیم و تربیت کے حالات بالکل نہیں معلوم ہو سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے حضرت ایوب کی درس گاہ نبوت و رسالت سے بہت علمی فائدہ اٹھایا تھا۔ لیکن واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ انکی فطری دانائی کی مدد سے انھوں نے اپنے آپ کو خود حکیم بنایا۔ اور خدا کو فائدہ کوئی اور شخص کسی استاد سے اٹھایا کرتا ہے انھوں نے خود اپنی روشن ضمیری اور اپنے قریب کو صالحہ سے اٹھایا۔

چنانچہ ایک دن اپنے تلامذہ اور خوشہ چیان محبت فیض کو حکمت و دانائی کا درس دے رہے تھے کہ ایک شخص سامنے آئے کھڑ ہو گیا۔ دینک انکی صورت پر غور کرتا رہا۔ اور آخر پہچان کے بولا تو وہی وہ نہ جو فطان مقام پر میرے ساتھ بکیران چرایا کرتے تھے۔ ہاں لقمان نے جواب دیا۔ ہاں میں ہی شخص ہوں۔ تب اس نے نتیجہ جو کہ گما دو تو یہ مرتبہ تھیں کیونکہ حاصل ہوا ہے، فرمایا مرن دو باتوں سے ایک تو سچ بولنا۔ اور دوسرے بے ضرورت بات نہ کرنا،

یہ واقعہ کئی روایتوں سے ہم تک پہنچا ہے۔ جن میں سے ہر ایک میں تھوڑا بہت اخلاف ہے اور بعض باتیں بڑھی ہوئی ہیں۔ ایک میں حضرت لقمان کا آخری جواب یہ ہے کہ وہ اللہ کی قدر جاننے۔ امانت کے ادا کرنے پر سچ بولنے۔ اور فضول بات نہ کہنے سے میں نے یہ مرتبہ حاصل کیا ہے ایک تیسری روایت میں یہ ہے کہ کثیرین چیزوں نے مجھے اس رتبہ کو پہنچایا یہ ہیں نظربچی رکھنا۔ زبان کو روکنا۔ غذا کو پاک رکھنا۔ شرکاء کو قابو میں رکھنا۔ سچ بولنا۔ عقیدہ کو پورا کرنا۔ جہان کی عزت کرنا۔ بڑوسی میں مدد و حمایت کرنا۔ اور جس چیز میں کوئی فائدہ نہ ہو اسے ترک کر دینا، اور پھر اس کے بعد فرمایا اگر تم یہ کرو تو تم بھی ایسے ہی ہو جاؤ گے،

اس واقعہ سے اشارہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لقمان ابتداً غلام تھے اور اپنے آقا کی بکیران چرایا کرتے تھے پھر اس کے بعد اسکی امر مانی سے آزاد ہو گئے۔ اور لوگوں کو علم حکمت کی تعلیم دینے لگے۔ ابودرداء نے ایک بار لقمان کے حالات و فضائل بیان کرتے کرتے کہا میں نے جنی خوبیاں تھیں وہ ان کو نہ گھرواؤں سے ملی تھیں۔ نہ حسب نسب سے بلکہ وہ ایک شمشیر برآں۔ دھن کے پورے خاموش۔ ہر امر میں غور و فکر کرنے والے۔ ہر معاملے پر گہری نظر ڈالنے والے بزرگ تھے۔ دن کبھی سوئے نہ تھے۔ اور شرم کی یہ حالت تھی کہ کبھی کسی شخص نے انھیں تھوکتے کھنکھارتے۔

پیشاب کرتے۔ پینچانے جاتے۔ نہانے ہنستے۔ بات کو دوسرے نہیں دیکھا۔ یہ اور بات تھی کہ کسی حکمت کی بات کو کوئی شخص دوبارہ پوچھے اور انھیں اُس کی تفسیر دوبارہ کرنی پڑے۔ غلامی کے زمانے ہی میں انھیں یہ کمالات حاصل ہو گئے تھے۔ اور خود انکا مالک بھی اپنے غلام کے ان باطنی کمالات سے واقف ہو گیا تھا۔ چنانچہ اُس نے ایک بار ایک بکری کی طرف اشارہ کر کے ان سے کہا: ”بھائی! اسے زچ کر وں۔ در گوشت کا بہترین حصہ نکال لاؤں۔“ انھوں نے فوراً بکری زچ کی اور اُسکی زبان اور اُسکا دل لیجا کے مالک کے سامنے رکھ دیا۔ دو چار روز بعد اُس نے دوسری بکری دی اور کہا: ”اب کی گوشت کا بدترین حصہ نکال لاؤں۔“ یہ کہنے بکری کو زچ کیا۔ اور پھر وہی زبان اور اُسکے سامنے لاکے رکھ دیے۔ مالک انکا یہ فعل دیکھ کے نہایت ہی متحیر ہوا اور کہا: ”یہ کیا؟ میں نے گوشت کے بہترین حصے مانگے تب بھی تم اسی دل و زبان کو لائے اور بدترین حصے مانگے تو اب بھی تم وہی دونوں چیزیں لے آئے ہو؟“ انھوں نے عرض کیا: ”مختصر میرے نزدیک تو ایسا ہی ہے۔ یہی دل و زبان اگر پاک ہوں تو ان سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ اور اگر ناپاک ہوں تو ان سے بُری بھی کوئی چیز نہیں۔“

اُنکی شادی بھی ہوئی تھی۔ اور ایک صاحبزادے تھے جنکا نام شاران تھا۔ ایک اور بیٹا بھی ہوا تھا جو اُنکے سامنے دنیا سے رخصت ہو گیا۔ بیٹے کی موت دل کو کھانا تک چوڑ نہ لگی ہوگی۔ مگر انکھیں نہیں ترہونے پائیں۔ اور نہ کسی نے اُسکے غم میں کبھی روتے دیکھا۔ اپنے عہد کے امرا و سلاطین کے درباروں میں بھی کبھی کبھی چلے جاتے تھے۔ مگر وہاں بھی کبھی کوئی غرض ایسے نہیں گئے۔ بلکہ ہر من و عہد حاصل کرنے کے لئے اور حکمت و دانائی کی باتوں کی تلاش میں جایا کرتے رہے۔

لقمان اگرچہ نبی اسرائیل اور خاصۃً حضرت داؤد کے معاصرین ہیں مگر تورات میں کسی جگہ انکا ذکر نہیں۔ اور نہ تورات کی تاریخ سے اُن کے حالات کے متعلق کسی بات کا پتہ لگ سکتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ حضرت لقمان کے نام کو جو کچھ شہرت ہوئی دین محمدی کی بدولت ہوئی اس لیے کہ ائمہ علی شانہ نے وحی کے ذریعے سے اپنے پیغمبر برحق کو اُنکا نصیحتوں کے اُس حصہ سے مطلع فرمایا جو توحید کے متعلق تھا۔ قرآن پاک کی ایک سورۃ لقمان کے نام سے مشہور ہوئی جس میں صرف اس قدر مذکور ہے کہ داؤد قَالِ لِقَمٰنُ لَا یٰۤاِبْنُ دُوۤلٰٓیۡطَہٗ یٰۤاِبْنِیُّ کَاۤاِشْرَکَ بِاللّٰہِ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیۡمٌ اور جب لقمان نے اپنے بیٹے سے اُٹانے نصیحت میں کہا اے میرے بیٹے کسی کو خدا کا شریک نہ ٹھہرانا اس لئے کہ

محبتیں گنہگاروں کے لیے سزا ہیں۔ بیٹا کسی بات پر حجت تک مجبور نہ ہو جائو نہ منسو۔
 نہ بے مطلب کسی طرف قدم اٹھاؤ اور نہ اُس بات کو پوچھو جس سے تمہیں واسطہ نہیں۔
 بیٹا۔ اپنا مال ضائع نہ کرو اور دوسرے کے مال کی اصلاح نہ کرو۔ بخارا مال وہ ہے جو تم نے خدا کی
 راہ میں دیا اور دوسرے کا وہ ہے جسے تم نے اور دیکھے لیے چھوڑ دیا۔ بیٹا جو کوئی اور روئے پر رحم کرتا ہے
 خود اُس پر بھی رحم کیا جاتا ہے۔ جو خاموش رہتا ہے اس میں رہتا ہے۔ جو اچھی بات کہتا ہے اُس سے ملتا ہے
 اٹھتا ہے۔ جو جھوٹ بولتا ہے گناہگار ہوتا ہے۔ اور جو زبان اپنے قابو میں نہیں رکھتا نہ امت اٹھاتا ہے،
 بیٹا علما کی صحبت میں گھٹنوں کے بھل جاؤ۔ اور ان کے سامنے خاموش بیٹھ کے کان لگاؤ۔ سلیکے کے علما
 کے نور سے دل اُسی طرح زندہ ہو جاتا ہے جس طرح کہ مردہ زمین آسمان کے نیچے سے زندہ ہو جاتی ہے۔
 حضرت لقمان کی نصیحتیں اب زمر سے لکھنے کے قابل اور سچ یہ ہے کہ اخلاقی اور دیندارانہ زندگی
 کے لئے ان سے بہتر نصیحتیں نہیں مل سکتیں۔

عذر گناہ بدتر از گناہ

آزادی کج خلقی کا نام نہیں ہے۔ اور نجات چاہے علم ہی پر ہو بھی قابل تعریف نہیں ہو سکتی۔
 اگر کسی کی نسبت کوئی گناہ خیر (وہ دھوکے ہی میں سہی) زبان سے نکل گیا ہو تو اول تو ہمارے عزیزوں
 اُسکے واپس لینے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہو سکتی اور اگر فرض کیجئے کہ واپس لینے کی ضرورت ہو بھی
 تو بڑی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے تاکہ کسی کی دل شکستی نہ ہونے پائے۔
 پانچ کے رسالہ داندہ ۷۷، مین الہ آباد کے نئے اور اعلیٰ درجہ کے رسالے ادیب، کی
 نسبت یہ الفاظ شائع ہو گئے تھے کہ حال مین الہ آباد انڈین پریس سے ادیب ظاہری شکل و
 صورت میں اس آج رنگ کے ساتھ نکلا کہ تمام لوگ پکاراٹھے کہ سچ اس طرح کا جمال ہو
 ایسا شباب ہو ۷۷، ادیب کی ظاہری حالت اُسکی خوبصورتی اور اُسکی تصویروں کے لحاظ
 سے یہ کوئی نامناسب لفظ نہ تھے۔ اور اسپر شنبہ ہونا کیسا لوگوں کو یقین تھا کہ یہ الفاظ مولانا
 شبلی کے قلم سے نکلے ہیں لیکن اہل مدینہ لانا کے نہ تھے۔ اور اُنکی جانب منسوب ہو جانے سے اُن کے
 معصومی کے دامن میں ایسا دھبہ لگ گیا تھا جس کا دھوا جانا نہایت فروری تھا۔ چنانچہ
 اپریل کے اندوہ میں وہ دھبا دھوا گیا واصل تو کیا سکتا تھا بان یوں کہنا چاہئے کہ اُسی دھبا
 پر ہی ہوئی عبا کو نووی عبد السلام صاحب ندوی سب ٹیڑا لندہ نے مولانا کے جسم اہل سٹار کے خوب

اور فرماتے ہیں مولانا کی ذات اس سے ارفع ہے گناہ کے قلم سے عام رسالوں کے متعلق ایسے مبالغہ آمیز الفاظ نکالیں، اس خیال کے اظہار کے ساتھ عام رسالوں پر عام حملہ کرنے اور اپنے دشمنانکے بتخوش کے الم نشرح کرنے بھی النددہ کو چین نہ آیا اور یہ بھی نہ گوارا ہوا کہ اسکا سبب یہ طبعی ”ادیب“ کی اتنی تعریف کرے چنانچہ مولانا ندوی مولانا شبلی کے پاکدامنی کی شہادت دینے کے بعد اپنی سابقہ فیاضی کے ایک بڑی حد تک واپس لینے کی غرض سے فرماتے ہیں ”ہمیں بھی جو کچھ لکھا تھا اسکا تعلق رسالہ کی مادی حالت سے تھا مضامین کے لحاظ سے ہم اردو کے کسی رسالہ کو ذوق نہیں سمجھتے، کیونکہ حضرت ۶ ادیب کی توجہ یہ خطا تھی کہ آپ کے قلم سے اس کی تعریف نکل گئی۔ اس پر بگڑے ہیں کہ کوئی مجھے لیون یاد آئے، لکڑا رو کے اور سب رسالوں نے کون سا مقصود کیا تھا جو آپ سب پر منہم آگئے۔“

ناوک نے اس کے صید نہ چھوڑا نہ مین تڑپے ہر مرغ قبلہ نما اشیاء نے مین اچھا صاحب ہم نے مانا کہ آپ اردو کے کسی رسالہ کو ذوق نہیں مانتے لیکن النددہ کو تو ذوق مانتے ہوئے یا اسے بھی مینیں بنیکل سے آپ کی نظریں ذوق ہونا چاہیے کیونکہ وہ ذوق نہوگا تو اور رسالوں کے ذوق نہوے کہے تو اسے کی کیا وقعت رہے گی ۶ اور ادیب کی طرف پیار کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے آنا اور اسے کہے ہوئے مکرار دینا نار معشوقانہ کے بجائے ایک مجنونانہ فعل تصور کیا جائے گا لیکن سچ یہی ہے کہ جب اردو کے سب رسالے بے وقت ہو گئے تو اکیلے ایک النددہ کے سر پر فقیست کی پیکر ٹی بندھی بھی تو کیا۔ لہذا اردو کی پیکر ٹی اگر مولانا النددہ نے اتاری تو انکی ہم آواز لیتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ النددہ اردو کے بدترین رسالوں میں ہے۔ اور رسالوں سے توجہ دینوی حیثیت سے اسلامی پبلک کو کچھ فائدہ بھی پہنچ جانا ہو مگر النددہ اس کے لیے کہ مسلمانوں کے عقائد کو بگاڑے اور تقدس مآب کی عباہن کے اعتزال کی تعلیم دے اس وقت تک کوئی اچھا کام نہیں کر سکا۔

طریری دنیا میں آنے کے بعد ہر طرف سے تحسین و مہربانی آواز میں کان میں آئے لگتی ہیں ایسی آوازیں ان گزشتہ پچیس تیس سال میں اکثر ہمارے کانوں میں بھی آتی رہی ہیں اور انکی تحسین کے ہزار ہا شرفیک جو پبلک سے ملے ہیں ہم بھی پیش کر سکتے ہیں مگر وہ لوگ قوم میں نہایت ہی بڑا اور ناپاک نمونہ ہیں جو ان تعریفوں پر پھوٹی کے سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم چین دیکر نہ نیست، افسوس عوام کی تو تھوڑی بہت صلاح ہو بھی جاتی ہو مگر علما سے بغیر غوث اور ذہبی کا مرض نہ جانا تھا نہ کیا

علم سے ہمارے نزدیک حرفِ اتنا ہی ہوتا ہے کہ اپنے عجزِ ادنیٰ لاعلمی کی معلوم ہو جاتی ہے۔
لہذا فرمے کہ علمِ علمائین انکسار پیدا کرے کیونکہ ان سے زیادہ اس بات کو کوئی نہیں جان سکتا کہ
فصولِ دعویٰ کس قدر بنیاد ہو کر رہے ہیں۔ جن علمائین تجھ کو دوسری کا مادہ ہو وہ یقیناً نہایت
ہی جاہل بلکہ جاہلون سے بدتر ہیں۔

الندوہ میں ادیب کی تعریف میں جو جذباتِ الفاظ لکھے گئے تھے وہ خود پیکار کے کمر ہے ہیں کہ
مولوی مندوہ صاحب نے حرفِ ادیب کی ظاہری صورت کی تعریف کی تھی اور فضیلتِ بآلی کی سنت
قدیم کے مطابق خالی صورت پر زلفیت ہو گئے تھے کیونکہ فرماتے ہیں انڈین پریس سے ادیب ظاہری
شکلِ صورت میں اس لٹ رنگ کے ساتھ نکلا کہ تمام لوگ پکار اٹھے۔ ہم اس طرح کا جمال ہو یا سیاہی ہو
ان الفاظ کو پڑھ کر کسی کے دل میں اس بات کا ذرا بھی شبہ نہ گذر سکتا تھا کہ جناب قبلہ نے اُسکے مضامین کی
تعریف فرمائی ہے اور جب یہ پہلے ہی سے اُسکا اٹھا تو پھر اس منظر کے معنی ہی کیا کہہ سکتے ہیں جو کہ لکھا تھا اُسکا
تعلق رسالہ کی مادی حالت سے تھا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ ادیب کی محبت سے باز دعویٰ دینے
پر بھی مولانا الندوہ اپنے آپ کو پاکدامن نہیں ثابت کر سکے کیونکہ ادیب کی مادی یا دوسرے الفاظ میں
یون کہتے کہ سنہلی اربائی کے اب بھی قائل ہیں بلکہ کے دربار میں تو یہ مداخل کر کے مولانا کو حقیقت اپنے پہلے
ریوہ کے کسی جز کو بھی وہی نہیں سکے۔ یہاں اتنے تجر کا اضافہ التیہ ہو گیا کہ مولانا کی شان اس ارفع ہر اور اندوہ کی
نظر میں اردو کا کوئی رسالہ قریع نہیں اس کیلئے نمونہ عذر گناہ بدتر از گناہ کا نہیں ہو سکتا۔

خلیفہ ہارون رشید نے ایک بار کہا تھا کہ یہ عذر گناہ بدتر از گناہ، کا مشہور مقولہ لغو ہے۔
یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ گناہ کی عذر خواہی کی جادے تو وہ خود گناہ سے بھی بڑھ جائے؟ دربارِ کشمیر
طبع شاعر ابو نواس نے عرض کیا کہ میں کسی وقت اسکی صحت کا یقین نہ دوں گا اس کے بعد شام کو ابو نواس
زنائی ڈیوڑھی کے پرے کے پاس چھپ کے کھڑا ہو رہا اور جب خلیفہ محل میں چاٹکا تو دوڑ کے پٹ گیا اور اسکا
منہ چوم لیا۔ خلیفہ نے گھبرا کے اور بہت تلیش کھلے کہا "اے ابو نواس گھبرا کے بولا حضور ہیں
میں سمجھا تھا زبیدہ خاتون (رشید کی خاص محل) ہیں۔ یہ جواب سنتے ہی رشید اور برفروختہ ہوا اور ابو نواس
نے ہاتھ جوڑ کے کہا حضور عذر گناہ بدتر از گناہ اسکو کہتے ہیں، اس بدتر از گناہ معذرت کی سولی لٹک چھین
بڑی شہرت ہو۔ مگر ہمارے خیال میں مولانا الندوہ کی یہ بدتر از گناہ معذرت اسکی بھی بڑھی ہوئی ہے۔
وہاں تو اکیلی ایک بیدہ خاتون پر حملہ ہو گیا تھا یہاں ایک سرے سے سب ہی کی لکڑی اتار لی گئی۔
مگر مولانا ہم تو بے لکڑی کے بھی جی لین گے آپ اپنی لکڑی بٹھالے۔

نظم معری

سنسکرت - یونانی - لاطینی - انگریزی اور اُورپ کی دیگر زبانوں میں ایک قسم کی نظم ہوتی ہے جس میں قافیہ کی پابندی نہیں کی جاتی جسے انگریزی زبان میں "بلنڈ" س کہتے ہیں۔ یہ نظم ڈراما کے لئے نہایت ہی مناسب بلکہ لازمی ہوتی ہے کیونکہ مکالمہ سے صحیح لطف سوا اُس کے اور کسی قسم کی نظم میں نہیں حاصل ہو سکتا اس نظم میں ایک مصرع کے الفاظوں کے کئی زبانوں پر جاسکتے ہیں گفتگو سادہ اور بے تکلف رہتی ہو اور پھر اُس کے ساتھ موزونیت کا سلسلہ بھی قائم رہتا ہے۔

اگرچہ بادی النظر میں نظر آتا ہے کہ قافیوں کی قید سے آزاد ہونے کے باعث ایسی نظمیں لکھنا زیادہ آسان ہو گا مگر دراصل یہ سب قسم کی نظموں سے زیادہ دشوار ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اور سب نظموں میں الفاظ کا اپنی اصلی اور صحیح ترتیب سے ہٹنا کسی کسی حد تک جائز سمجھا جاتا ہے مگر اس میں چونکہ مکالمہ اور بے تکلف گفتگو سے زیادہ کام پڑتا ہے اور شاعری کی حقیقت شاعر کا یہ قائم رکھنا پڑتی ہے اس لئے اس میں ترتیب الفاظ میں ایک لڑنے بغیر بھی معیوب ہے۔ یا یوں کہیے کہ تعقید غلطی سب نظموں میں تقویٰ بہت جانتے ہیں مگر اس میں مطلقاً جائز نہیں اور اس وجہ سے تصور کرتا کہ اس قسم کی نظم لکھنا آسان ہے بڑی فاش غلطی اور ناقصیت کی دلیل ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ بلنڈ (نظم معری) ہر طرح کی نظموں سے زیادہ دشوار ہے۔

سب کے پہلے اس نظم کا سلسلہ ہم نے دکنڈاز میں چھپوا تھا۔ اور نہ اُس کے چھپنے میں کڑیاما بھی شایع کرنا شروع کر دیا تھا جسکو تعلیم یافتہ گروہ نے یا اُن لوگوں نے جنہیں موجودہ مذاق سخن سے اُٹس ہے بہت پسند کیا۔ مگر مرنے مذاق کے شعرا میں جو اگلے رنگ انشا کے دلدادہ ہیں اختلاف پڑا۔ بعض نے پسند کیا اور بعض نے ناپسند۔

ایسے امور میں اسے قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ جس چیز اور جس بات سے مانوس و آشنا ہو جاتی ہے اُس کے خلاف کسی چیز اور کسی مذاق کو چاہے وہ کیسا ہی اچھا ہو نہیں پسند کرتی بلکہ لباس ہی کو بھیجے۔ اپنے وطن کا لباس جس سے نظمانوس ہو جاتی ہے اُس کے تمام عزیز نگاہ سے مخفی رہتے ہیں۔ ہر حیثیت اور ہر پہلو سے وہ بھلا اور اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اور انسان جب دوسرے ممالک اور بلاد میں جاتا ہے تو وہاں کی ہر چیز اور ہر وضع پر ہنستا معترض ہوتا۔ اور وہاں کے لوگوں کا مذاق اڑاتا ہے۔ جس کی بنیاد کوئی معقول بات نہیں

ہوتی بلکہ صرف اُسکی نامانوسیت ہو ا کرتی ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں بہ اختلاف مذاق و وضع ایک گھڑی کے لیے بھی قایم نہ رہتا بلکہ ہر شخص دوسرے کی اچھی وضع کو جو عقل کے فیصلہ کی بنا پر اچھی ثابت ہوئی فوراً اختیار کر لیتا۔ اور ساری دنیا میں عجیب قسم کی یک رنگی اور ہم وضعی ہوتی۔

الغرض اسی غیر مانوسیت کے باعث بہت سے یک رنگ اور قدامت پرست لوگوں نے اس نظم کو بھی جو باہر کی کائی ہوئی تھی ناپسند کیا۔ اور اس پر اپنے ذہن سے تراش تراش کے طرح طرح کے اعتراض شروع کر دیے۔

ہمارے یہاں لوگ حقیقت اور معنوی امور کو چھوڑ کے لفظی بحثوں کے زیادہ عادی ہو چکے ہیں۔ شاعری ہی کی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مدت دراز سے لوگ زیادہ تر اسی قسم کے حیات اور جھگڑوں میں پڑتے ہیں کہ یہ لفظ مذکور ہے یا مونث۔ یہ قافیہ جائز ہے یا نہیں۔ کون سا حرف جائز ہے اور کون نہیں۔ اس کے مقابل مضامین اور معنوی خوبیوں کی طرف شعرا کا اس قدر خیال نہیں جاتا جتنا کہ لفظی محاسن کی طرف جاتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ معنوی خوبیوں کا لحاظ چھوڑ دیا گیا ہے مگر یہاں یہ فرد کو ملتا کہ الفاظ کی ظاہری صورت سے زیادہ لحاظ انکے معنوی پہلو کا ہونا چاہئے تھا۔ اور یہ نہیں ہوتا۔ یا ہوتا ہے تو بہت کم۔

انھیں لفظی نزاعوں کے رُجحان کا نتیجہ تھا۔ کہ جب میں نے اس نظم سے بحث شروع کی تھی اُس وقت بھی یہ بحث چھڑی تھی کہ اس قسم کی نظم کو نظم کہہ سکتے ہیں یا نہیں اور اب بھی اس موقع پر زیادہ بحث یہی ہو رہی ہے۔ رسالہ فصیح الملک میں اس نظم کے تعلق بہت کچھ بحث ہوئی ہے اور بعض حضرات نے بڑی قابلیت سے مضامین لکھے ہیں۔ مگر اکثر مضامین میں یہی بحث چھڑی گئی ہے اور معنی بہت زور دے رہے ہیں کہ ٹیلیک ورس کو نظم کے لفظ سے تعبیر کرنا غلطی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فارسی و عربی کتب عروض میں اسی قسم کے کلام کو ”شعر جزو“ بتایا گیا ہے مگر جن لوگوں نے فن عروض پر زیادہ وسعت اور غور کے ساتھ نظر ڈالی ہے اور یونانی و انگریزی محققین کے فیصلوں کو بھی دیکھا ہے۔ وہ یہ کہتے پر مجبور ہیں کہ شاعری ایک خاص قسم کی تخیل کا نام ہے جسے قافیہ وغیرہ کی کچھ ضرورت نہیں بلکہ ایک خاص قسم کی خیال آفرینی اور خاص وضع کے طرز اد کو شاعری کہتے ہیں نہ محض قافیہ پیمائی کو۔

مگر ٹیلیک ورس، کو زبان اردو میں اُج دیتے وقت اس سے زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ نظم ہے یا شعر۔ بلکہ اصلی بحث یہ ہونی چاہئے کہ یہ شعر ہے یا کلام عام اس سے کہ

نظم سہیا نثر سوزوں سہیا غیر سوزوں۔ اردو لٹریچر میں اس کے اصناف کی ضرورت ہے یا نہیں۔ یا اس سے بھی تنزل کر کے کہا جائے کہ اس قسم کے کلام سے اردو نظم و نثر اور ہمارے لٹریچر کو کوئی ضرر تو نہ پہونچے گا؟ اور ایسی نظمیں ہماری زبان میں قابل برداشت ہیں یا نہیں؟

کسی لٹریچر میں جب کوئی نئی چیز پیش کی جائے تو پہلا تصفیہ سی امر کا ہونا چاہئے کہ آیا ہم اس طرز کلام کو جس سے اس وقت تک نا آشنا رہے ہیں گوارا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ کیونکہ امتداد اس نئی صنف سخن کی خوبیوں کے بجائے صرف اس کے جائز ہونے سے بحث کرنی چاہیے۔ یہی اس کی خوبیاں وہ اس وقت کھلین گی جب ہمارے مذاق اس سے آشنا ہوں گے۔

بلیک درس، کے جائز اور گوارا ہونے کے لیے پہلے ہمیں اس پر نظر ڈالنی چاہیے کہ اردو لٹریچر کو اس صنف کلام کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ ہمارے قدیم مذاق کے شعرا ابھی اس کی ضرورت کو نہ محسوس کر سکیں گے مگر مجھے یقین ہے کہ وہ روز بروز زیادہ محسوس ہوتی جائے گی۔ اور ملک بین انگریزی تعلیم کو جس قدر زیادہ رواج ہوگا اسی قدر لوگوں کو بلیک درس کی ضرورت بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ نظر آتی جائے گی۔

اب اردو میں ڈراما فردر تصنیف ہونگے۔ کیونکہ جو لوگ انگریزی میں ڈراما کا لطف اٹھا چکے ہیں وہ تا وقتیکہ خود اپنی زبان میں ڈراما کا لطف نہ پیدا کر لیں ہرگز چین نہ لیں گے۔ ایک طرف تو وہ یہ چاہتے ہیں کہ شکسپیر اور کالیڈاس کے نامکون کا اردو میں ترجمہ کیا جائے اور اس طرح کہ جو لطف انھیں اصلی زبان میں آتا ہے وہی اردو ترجموں میں بھی آئے۔ دوسری طرف وہ چاہتے ہیں کہ اسی عنوان پر ہمارے جذبات و واقعات کی تصویریں اردو ڈراما میں دکھائی جائیں۔ یعنی خود اردو میں نہ اردو ادب بخیل ڈراما تصنیف ہوں۔

اس ضرورت کے تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کا یہ شوق بغیر نظم معری (بلیک درس) کے رواج دیے اردو کے موجودہ اصناف سخن سے بھی پورا ہو سکتا ہے یا نہیں؟ جو حضرات ڈراما کی حقیقت و حالت سے واقف نہیں وہ تو بے تکلف کہہ دینگے کہ کوئی خیال اور کوئی واقعہ نہیں جسے ہم اپنی موجودہ شاعری کے ذریعے نہ ادا کر سکتے ہوں مگر جو لوگ جانتے ہیں کہ ڈراما کیا چیز ہے وہ اس بات کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ بغیر نظم معری کے اختیار کئے اردو میں ڈراما لکھے ہی نہیں جاسکتے۔

جو ناظرین انگریزی مذاق سخن سے ناواقف ہیں ان پر ڈراما اور بلیک درس کی

نوعیت کے ظاہر کرنے کے لیے میں اپنے ایک پرانے ڈراما کا کسی قدر حصہ چند مقامات سے منتخب کر کے پیش کرتا ہوں۔

مثلاً حاکم سبط کی بیٹی فلورنڈہ جو راقی بدکار بادشاہ اسپین کے محل میں ہے اور اسکی

بدکاریوں سے ہراساں ہے۔ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی کہہ رہی ہے۔

فلورنڈہ - کس غضب میں پڑ گئی ہوں! آہ! کچھ بننا نہیں!

کیا کروں؟ کس سے کمون؟ کیونکر کمزروں؟ اور کون ہے

جھکے آگے سر کو دے مار دوں؟ یہاں کوئی نہیں

جو خیرے اس مصیبت میں مری۔ افسوس! میں

پھنس گئی کیسی بلا میں؟ میں تو آتی ہی نہ تھی

آہ! والد نے نہ مانا! اور مجھے قسمت میں اب۔

کیا لکھا ہے؟ اور کیسی ذلتیں ہوتی ہیں؟ اسے

راقی با ظالم تجھے کچھ شرم بھی آتی نہیں؟

مرہنہ جانا ہے کیوں؟ جو میرے ظلموں سے بچیں

گڑکیاں شاہی گھرانے اور مغز لوگوں۔

(کچھ آہٹ پا کے) کون؟

یا ایک جگہ اس دفع سے سین دکھا یا گیا ہے کہ عیسے (ہیرو) قلعہ کے اوپر دریا کنارے

بٹل رہا ہے اور غروب آفتاب کا تماشا دیکھ کے کہتا ہے۔

عیسے - (خود بخود) آہ دنیا! تجھ میں کیا کیا لطف ہیں! کس شان سے۔

دیکھو سورج ڈوبتا ہے! اور کون کس طرح

پانی پر افشان چٹوڑتی ہیں! اُدھر اُس کو ہمارا

کو ظلالی کپڑے سورج نے بچھائے ہیں۔ جہاں

گھانسی کی وہ ننھی ننھی بتیاں اس دھوپ میں

جگنوؤں کے مثل تاباں ہیں۔ وہاں اُس بیل نے

کیا ظلالی جھار بن مقیش کی لٹکا لی ہیں!

بھول بھی ہر رنگ کے اُس جا کھلے ہیں۔ اور وہ

دیکھو کلیان شکراتی ہیں عجب انداز سے !
 دیکھ کر یہ لطف چڑیاں کیسی خوش ہیں ! اور کس
 جوش سے سب چہچہاؤ مٹھتی ہیں ! کیسی شاد ہیں !
 جس کو دیکھو خوش ہے۔ لیکن آہ ! اک میں ہوں کہ
 کو قرار آتا نہیں ! الجھن ہے۔ بیتابی ہے۔ اور
 ہر گھڑی اک وہو ہے۔ پیاری فلوزنڈا ! کتنے
 اک نظر دیکھو جن تو چین آئے۔ کہاں ایسے نصیب !
 میں تڑپتا ہوں یہاں۔ تو اندیش کے باغون میں
 سیر کرتی۔ ناز سے اٹھلاتی۔ ہنستی۔ بولتی۔
 کھلکھلاتی۔ تو رتی پھولون کو۔ پھر ان کو بچ
 ناز سے سر پر لگاتی ہوگی۔

دیکھ آہٹ پاکے اور ایک آواز شن کے

کیا یہ کون تھا ؟

یہ تو اظہار خیالات و جذبات کے موقع تھے۔ اب ذرا گفتگو کی شان بھی ملاحظہ ہو۔
 مریم راورق کے دست ستم سے اسکی سابقہ کی مدد سے بچے فلوزنڈا کے پاس آئی ہے وہ سابقہ کی
 ہے اور مریم محل سے بھاگنے کا قصد کرتی ہے۔ اس وقت تینوں عورتوں میں یہ گفتگو ہوتی ہے۔

مریم۔ (آفتی مشرق کو دیکھ کے) صبح اب ہونے کو ہے

دیکھیے جھونکے نسیم صبح کے وہ آب کی
 زلف برہم کر رہے ہیں۔ اور تارون کے چراغ
 جھللاتے ہیں فلک پر۔ اور سیہ چادر یہ شب
 کی مسکتی جاتی ہے۔ ایسا نہ ہو چڑیاں اٹھیں۔
 اور جگا دین راورق کو۔ میں نو جاتی ہوں بہن۔
 کیا کر دو گی جا کے اب ؟

فلوزنڈا۔

ساقیہ۔

فلوزنڈا۔

ان کو نہ روکین

کس لیے ؟

ساقیہ بادشہ کو گردِ راہی شک ہوا تو بس مجھے -
اور ان کو قتل کر ڈالیں گے -

فلورنڈا تو جاؤ بہن

اب کہا جاؤ گی تم؟

مریم - جس جا خدا لے جا

فلورنڈا تم

کس طرح جاؤ گی ان سے؟

مریم - خاک اڑاتی - ٹھوکیں -

کھاتی - نگہ پاؤں جاؤں گی بہن - اور جس طرح
بن پڑے گا - آپ کو پہنچاؤں گی نر بون میں -

ساقیہ کیوں نہیں جاتی ہو سب طہین؟ جہان آرام سے

قعر میں اپنے بچہ بچا کے زندگی بھر رہ سکو -
خیر جاؤں گی وہیں -

مریم -

لیکن وہاں تو ان دنوں

ہو گی یورش کا فون کی ہر طرف - اور کوئی شخص
جانے سکتا ہو گا اندر شہر کے -

فلورنڈا

مریم - میں جاؤں گی جیسے بنے -

تو مرا سب حال کہہ دینا -

فلورنڈا

ضرور

مریم - اور یہ کہ اب -

فلورنڈا

محبوب جلدی والے بلا لیں

مریم - لو خدا حافظ بہن -!

(چلی جاتی ہے)

ہمارے اس ڈراما کے چھ سینس ۱۹۸۷ء کے آخر اور ۱۹۸۸ء کی ابتدا میں دنگداز کے صفحوں پر
شائع ہوئے تھے - پھر اسکے بعد نو بت نہ آئی - اور یہ ڈراما نا تمام پڑا رہ گیا -

اس موقع پر اس کے ان چند ٹکڑوں کو سخن سنان ملک کے سامنے پیش کر کے بین دریافت کرتا ہوں کہ معنی نظمیں بین یہ خیالات اسی عنوان اور ایسی شرفا تر میت سے ادا کیے جاسکتے ہیں؟ اور باہمی گفتگو میں اسی طرح کی سادگی کے ساتھ بھرتی کے الفاظ سے بچنا ممکن ہے؟ یا نہیں؟ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ناممکن ہے۔ اور پھر اس کے ساتھ اسکا بھی خیال کیا جائے کہ اب اردو کو ڈراموں کی ضرورت ہے ایسی حالت میں سوا اسکے کہ اس قسم کے کلام کو عام اس سے کہ آپ اسے نظم معری کہیں یا شعر مرخیز اردو میں رواج دیا جائے اور کیا کیا جاسکتا ہے۔

شعراے اردو سے یہ نہیں کہا جاتا کہ آپ غزل گوئی اور قصیدہ خوانی کو موقوف کر دیں۔ یہ بھی نہیں درخواست کی جاتی کہ تنویران نہ لکھی جائیں۔ نہ یہ خواہش کی جاتی ہے کہ وہ آئندہ قطعات و رباعیات یا محسن مسدس نہ کہیں وہ اس پر بھی مجبور نہیں کیے جاتے کہ نواد خواہ اس قسم کی نظم معری وہ بھی کہا کریں۔ پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ نزاع کس بات کی ہے؟ انتہا سے مافی الباب یہ ہے کہ اگر کوئی انگریزی ذائق اور حیدر رنگ دلدادہ اس قسم کی نظمیں شایع کرے تو جن حضرات کو وہ ناپسند ہوں وہ انھیں نہ مذاخط کریں۔ چھٹی ہوئی۔

بلیک ورس بن جب عروض کی بجدون کی پوری طرح پابندی کی جاتی ہے تو اسے غیر موزون ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جاسکتا ہے اسی قدر ہے کہ نظم کے جن اصناف سے ہم آشنا ہیں یا جن کو اگلے دنوں ہم نظم کہا کرتے تھے اُن کے حلقے سے یا انھوں نے نظم خارج ہے۔ ورنہ صرف قافیہ کے نہ ہونے سے اس وضع کے اشعار کو غیر موزون کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

زمانے کی پیشین گوئی ہے کہ اس قسم کی شاعری کو اردو میں رواج ہوگا۔ اور آئندہ بڑے بڑے نازک خیال شعرا اس رنگ میں طبع آزمائی کریں گے۔ آپ چاہیں منظور کریں یا نہ کریں یہ ہونے والی چیز ہے اور ہم گرنستانی بہستم میرسد۔

اپنا مطلب

قدر و زمان دنگلڈاز۔ اب دو باتیں ہمارے مطلب کی بھی سن لیجیے۔ ہم نہایت ہی شکر گزار ہیں کہ بلیک نے دنگلڈاز کے حال پر خاص توجہ کی۔ ہمارے بہت سے احباب نے بڑی کوششیں کیں اور اپنے بہت سے احباب کو خریداری پر آمادہ کرا دیا۔ مگر ایسے بچے مہربان افسوس کہ کھوڑے

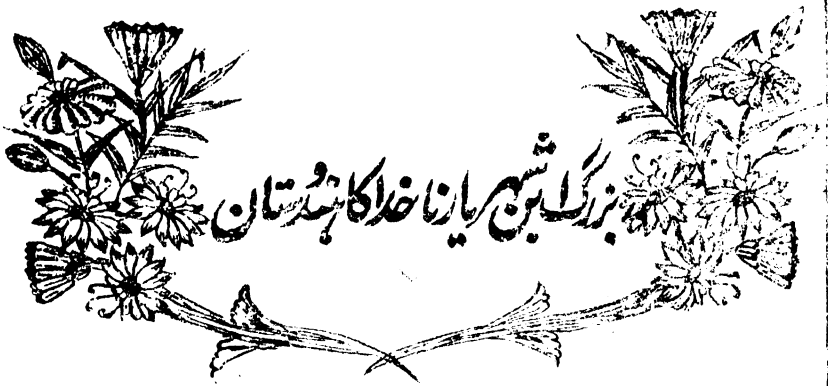
اور چنگیزی کے احباب بین جھون نے ہماری التجا کو سنا اور مدد کو آمادہ ہو گئے۔ لیکن قدر دانوں کی غالب جماعت نے ابھی تک اپنی بے بسی اور بے پروائی کی وضع کو نہیں بدلا ہے۔

مگر ہم پوری مستعدی سے اُن کی خدمتگزاری اور اُن کی علمی تجسسپویں کا سامان فراہم کرنے میں مصروف ہیں۔ اگرچہ بعض تقدیری آفات، جگر خراش، مصائب اور دل کو خون کرسنے والے سانحوں کی وجہ سے ہم دنگداز کو ابھی تک ٹھیک وقت پر نہیں نکال سکے مگر ہم ہمت نہیں ہارتے اور تقدیر سے لڑ رہے ہیں۔ غریب ہمارے ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے کہ دنگداز ٹھیک وقت اور اپنی اصلی مقررہ تاریخ پر یعنی ہر انگریزی مہینہ کی تجسسپویں کو شائع ہو رہا ہے۔ ہم نے ایک نیا اور بہت ہی دلچسپ ناول فلیپا نا شائع کر دیا۔ اور اب اُن لوگوں کو شکایت نہیں ہو سکتی جو دنگداز میں سے حصہ ناول کے موقوف ہو جانے پر اعتراض کر رہے تھے۔ پہلے انھیں ناول کے اجراء متفرق طور پر ملا کرتے تھے۔ جن میں سے ایک آدھ سال کے ختم اور ناول کے مکمل ہوتے ہوئے تلف ہو جاتا کرتا تھا۔ اور اب انھیں ایک مکمل و مرتب ناول درمیان سال ہی مل گیا۔ جو اُن پہلے ناولوں سے ہر بات میں بڑھا ہوا ہے۔ تاریخ کی ایک مکمل کتاب کے شائع کرنے کا سامان بھی کر دیا گیا ہے۔

ان سب باتوں کے علاوہ ہم ایک اور ناول چھپوا رہے ہیں جو ختم سال پر خریداران دنگداز کو مفت دیا جائے گا۔ بشرطیکہ وہ ۱۹۸۸ء میں بھی خریدار رہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہمارے ناظرین بمقامہ سابق کے ہر طرح نفع میں رہیں گے۔

لیکن اب بھی اکثر حضرات کا ہماری درخواستوں کو بے پروائی سے ٹالنا کس قدر حیرت انگیز ہے؟ دنگداز کی سالانہ محنت اب صرف ایک ڈیوٹی مع حصول ڈاک ہے اور یہ اس قدر کم ہے کہ ہمارے احباب اسے جس بلنے والے سے فرمائیں گے بے تکلف خریداری قبول کر لے گا۔ صرف اس قدر ضرورت ہے کہ انھیں یاد رہے۔ اور اپنے کسی خادم کے لیے لب ہلانا گوارا فرمائیں۔ آخر میں ہم اپنی امید ظاہر کرتے ہیں کہ انکی ہمارے سب قدر دان اپنے کسی نہ کسی ایک دوست کو فروز خریدار دنگداز بنادین گے جو کوئی دشوار امر نہیں ہے۔

خاکسار مہتمم دنگداز۔



ہندوستان میں ایک خاص قسم کے چور ہوا کرتے ہیں۔ ان کے گروہ شہروں شہروں مارے
مارے پھرتے ہیں۔ اور خوش حال تاجروں کے پاس پونچھتے ہیں عام اس سے کہ اسی
ملک کے ہوں یا باہر کے آئے ہوئے۔ اس کی بھی ضرورت نہیں کہ ان کے گھسہ میں
جہازیں۔ کبھی راستہ ہی میں گھیر لیتے ہیں۔ ان چوروں کا طریقہ یہ ہے کہ جس سے لینا
مقصود ہوتا ہے اس کا سامنا ہوتے ہی چھریاں نکال دیتے اور اسے دھکے دے دیتے ہیں
کہ اتنی رقم دے دے ورنہ تجھے مار ڈالیں گے۔ ان لوگوں سے بچنے کا سوا مطلب یہ رہتا ہے
کہ وہ دیکھ سکے اور کوئی علاج نہیں ہے۔ اگر کوئی اس کا دوست یا جو ملک کا راجہ
بچانا چاہے تو نہیں بچا سکتا۔ یہ لوگ اپنے مار ڈالے جانے کی پروا نہیں کرتے۔ اور
قبل اس کے کہ کوئی شخص ان پر حرج کرے یا انھیں پکڑے اس شخص کا کام تمام کر دیتے
ہیں۔ جہاں یہ لوگ کسی شخص کے پیچھے پڑ گئے پھر کسی کی مجال نہیں کہ ان سے بولے یا
انھیں غلام سے روکے۔ اور چونکہ ہر شخص کو اپنی جان کا خوف ہوتا ہے لہذا ان کے پیچ میں
کوئی بڑا تاجہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص انھیں کی مرضی پر چلتا۔ جہاں لینا کے
بٹھائیں بیٹھا۔ اور مطلوبہ رقم جان سے اور جس طرح بہنے فراہم کر کے دے دیتا۔
اور اپنی جان بچھڑاتا ہے۔ جب تک رقم نہیں ملتی یہ لوگ اس کے سر پر چھریاں تان کر
رہتے ہیں۔ وہ کھانا پیتا یا جو کام کرتا ہے ان کی چھریاں اس کے سر پر دھکیلی ہیں جب
رقم مل جاتی ہے تو مزدور پر لدوا کے اپنے گھر بھجواتے ہیں۔ اور جب تک آدھا روپیہ
گھر پہنچا کے وہ اس نہ آجائے اسے اسی طرح چھریوں میں گھیرے بیٹھے رہتے ہیں۔

اور اپنا پورا اطمینان کر لینے کے بعد اُس کا بچھا چھوڑتے ہیں۔

محمد بن مسلم سیرانی جو کچھ اوپر بیس سال تک مقام تھانہ میں مقیم رہا تھا اُس نے اکثر بلاؤں کا سفر کیا تھا اور یہاں کے لوگوں کے حالات و معاملات سے بخوبی واقف تھا۔ مجھ سے کہتا تھا کہ ایک بار اس قسم کے بارہ منڈ چڑھے۔ شہر صیور اور تھانہ میں آئے۔ اور ہندو تاجروں میں سے ایک شخص کو گھیر لیا۔ جس شخص کو انھوں نے گھیرا وہ تو چند ان دولت مند نہ تھا مگر اُس کا بوڑھا باپ بڑا مال دار تھا۔ اور اُس کا اکیس لایہی ایک بیٹا تھا منڈ چڑھوں نے اُسے اُس کے گھر پر آ کے پکڑا اور دس ہزار اشرفیان طلب کیں۔ چونکہ باپ پر یہ رقم گران نہیں گزرسکتی تھی اس لیے بیٹے نے اُسے خبر کی کہ مجھے منڈ چڑھوں نے پکڑ لیا ہے اور اتنی رقم مانگتے ہیں آپ ہی دستگیر ہی کیجیے گا تو اس آفت سے چھکارا نصیب ہو گا۔ باپ نے آ کے منڈ چڑھوں کی خوشامی کی کہ مجھ سے ایک ہزار اشرفیان لے لو۔ مگر انھوں نے سماعت نہ کی اور کہا دس ہزار اشرفیوں سے ایک کوڑی کم نہ لیں گے تب وہ بوڑھا راجہ کے پاس دوڑا گیا۔ اور اُس سے ساری کیفیت بیان کر کے کہا ”یہ تو بڑی خرابی ہوئی۔ یہی حال ہے تو آپ کے ملک میں کوئی کیسے رہے گا؟“ راجہ نے کہا ”ہم اس کا کیا بندوبست کریں؟ اگر ذرا بھی بولیں گے تو وہ لوگ تمہارے بیٹے کو مار ڈالیں گے۔ اُن لوگوں کو پکڑ کے سزا دینا امکان میں ہے۔ اور میں دے سکتا ہوں۔ مگر اس سے تمہارے بیٹے کی جان نہیں بچ سکتی۔ اور افسوس یہ ہے کہ یہی تمہارا ایک بیٹا ہے۔“ بڑھے نے کہا ”چاہے جو کچھ ہو۔“ مگر میں بیٹے کے لیے فقیر و محتاج نہیں ہو سکتا۔ حضور اُس مکان کے گرد لکڑیوں کا ڈھیر لگو ا کے آگ لگا دیں تاکہ وہ سب کے سب مع مکان کے جل مریں۔“ راجہ بولا ”اس طرح تو تمہارا لڑکا بھی جل جائے گا۔ اور اُس کے ساتھ تمہاری بی بی بھی جل کے خاک ہو جائے گی۔ جو اُسی مکان میں اپنے بیٹے کے ساتھ بڑھا بولا“ جل جائیں کوئی مضائقہ نہیں۔“ الغرض راجہ نے اُس کی تدبیر پر عمل کیا۔ اُس کے مکان کے گرد لکڑیوں کا انبار لگا کے آگ تباہی گئی۔ اور مکان مع اس کی بی بی بیٹے اور سارے مال و اسباب کے جل کے خاک ہو گیا۔ اور اُسی میں وہ منڈ چڑھ بھی جل گئے۔

بلاد ہند اعلیٰ و شمالی مین بڑھوں اور بڑھیوں کے زندہ جلا دینے کا رسم آج تک باقی ہے۔

بلاد و تہب (سراندیپ) اور زانج (جاوا) کے راجاؤں کے دربار میں لوگ چار زانو بیٹھا کرتے ہیں۔ اور اس نشست کے خلاف کسی اور وضع میں بیٹھا آداب شاہی کے بالکل خلاف ہے۔ اس نشست کو یہاں والے اپنی زبان میں ہر سیدھا کہتے ہیں۔ مسلمان تاجسر جوں درباروں میں جاتے انھیں بھی اس کی پابندی کرنا پڑتی تھی۔ اتفاقاً ایک راجہ کے دربار میں جس کا نام ”سرناتا کلمہ“ چرن ٹھا کر ہوا تھا۔ ایک مسلمان ناحدا گیا جو ”جو دو کوتاہ“ کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ وہ اُس کے دربار میں پہنچا۔ اور اسی ایک وضع میں بیٹھے بیٹھے اُس کے پاؤں رہ گئے۔ چنانچہ اُس نے آپ ہی آپ یہ تذکرہ چھڑا کر ”ملک عثمان میں ایک خاص قسم کی مچھلی ہوتی ہے جو کھند کھلاتی ہے اور وہ اتنی لمبی ہوتی ہے کہ اس کے اُس کے طول کا اندازہ بتانے کے لیے اُس نے اپنا ایک پاؤں پھیلا دیا۔ اور کھٹنے کو ہاتھ سے پکڑ لیا۔ پھر دوسرا پاؤں پھیلا کے اُسے گنج ران کے قریب پکڑا اور کہا ”بعض اتنی بڑی ہوتی ہیں۔“ اُس کے یہ حرکات دیکھ کے راجہ متحیر ہوا اور اہل دربار سے پوچھا ”اس وقت تجھ سید کا کون سا ذکر تھا؟ اس کی اس حرکت میں کوئی بات ضرور ہے۔“ ورنہ اس نے عرض کیا ”حضور یہ بوڑھا اور ناتوان شخص ہے درباری وضع میں بیٹھے بیٹھے پاؤں دکھ گئے تو پاؤں سیدھا کرنے کے لیے اس نے یہ بہانہ پیدا کر لیا ہے۔ یہ سُن کے راجہ نے کہا ”لہذا آئندہ دربار کی اس قید سے مسلمان تاجر معاف اور آزاد کیے جاتے ہیں۔“ چنانچہ اب یہ معمول ہے کہ مسلمان لوگ ران راجاؤں کے دربار میں جس وضع سے چاہیں بیٹھتے ہیں۔ ہندوستان کے عابدوں اور زادروں کی کئی قسمیں ہیں۔ اُن میں سے ایک گروہ بیکور کے لقب سے مشہور ہے۔ یہ لوگ دراصل سراندیپ کے رہنے والے ہیں۔ اور اہل اسلام سے نہایت ہی اُنس و محبت رکھتے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں یہ لوگ بالکل ننگے مادر زاد رہا کرتے ہیں۔ سو اس کے کہ ایک چار انگلی کا چیمڑا شرمگاہ پر رہتا ہے۔ ایک ڈورا کر میں بندھا ہوتا ہے (کردھنی) اُسی

اُس کو اٹھا لیتے ہیں۔ اور جاڑون میں گھاس وغیرہ کی چٹائیاں اور مٹتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایک کنگی بھی باندھتے ہیں جس میں ٹھنڈکھانے اور شہرت حاصل کرنے کے لیے ہر رنگ کے پیوند لگے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے پنڈے میں مردوں کی ہڈیوں کی خاک ملتے ہیں۔ سر منڈاتے ہیں۔ ڈاڑھی موچھون کے بال اکھاڑتے ہیں۔ مگر بغلوں اور موسے زہار کے ڈور کرنے کی نہیں کوشش کرتے۔ بعض بعض ناخن بھی کٹوا لیتے ہیں۔ ورنہ نہیں۔ اور عبرت حاصل کرنے کی غرض سے انسان کے کاسے سر میں کھاتے پیتے ہیں۔

اہل سراندیپ کو جب بعثت جناب سرور کائنات معلم کے حالات معلوم ہوئے تو اپنے ایک سمجھدار آدمی کو ارض حجاز میں بھیجا کہ آپ کے حالات دریافت کر آئے۔ اور پتہ لگائے کہ آپ کن باتوں کی وسعت کرتے ہیں۔ اس شخص کو مدینہ طیبہ تک پہنچنے میں دیر ہوئی اور جب پہنچا ہے آپ سفر آخرت فرما چکے تھے۔ ابو بکر صدیق نے بھی دو سال خلافت کر کے عالم آخرت کا راستہ لیا تھا۔ اور حضرت عمر فاروق مسند آرائے خلافت تھے۔ اُس شخص نے حضرت فاروق کے سادہ دربار میں حاضر ہو کے جناب رسالت کے حالات دریافت کیے۔ اور کئی باتیں معلوم کر کے واپس آیا۔ مگر مکران تک پہنچا تھا کہ راستہ میں مر گیا۔ اُس کے ہمراہ ایک ہندو لڑکا تھا جو اُسے خاک مکران کے سپرد کر کے سراندیپ میں واپس آیا۔ اُس نے یہاں آ کے حضرت عمرؓ کی تواسیح و انکسار۔ آپ کی وضع و قطع اور آپ کے لباس کے حالات لوگوں سے بیان کیے۔ اور کہا کہ آپ گڈڑی پہنتے ہیں۔ مسجد میں سوتے ہیں۔ انغرض یہی حالات سن کے یہاں والوں کو مسلمانوں سے انس ہو گیا ہے۔

اہل ہند کے نزدیک شراب عورتوں کے لیے حلال اور مردوں کو حرام ہے مگر بعض لوگ چھپ کے پیتے ہیں۔

چوری ہندون میں بہت مجرم ہے۔ اور اگر کسی نے چوری کی تو راجہ اُسے قتل کر ڈالتا ہے۔ اور اگر وہ دو تہذیبوں کو اُس کا سارا مال و اسباب ضبط کر لیا جاتا ہے۔

یاس پر کوئی بہت ہی بڑا بھاری جسٹس مانا گیا جاتا ہے۔ علیٰ ہذا اقیاس اگر کوئی شخص جان بوجھ کے چوری کا مال خریدے تو اس سے بھی بڑا بھاری جرمانہ وصول کیا جاتا ہے مگر اصلی سرقہ کی سزا قتل ہی ہے۔ لیکن اس سرزمین پر اگر کوئی مسلمان چوری کرے تو اسے مسلمانوں کا "ہنرمین" شریعت اسلام کے مطابق سزا دیتا ہے۔ بلا دہشت میں مسلمانوں کے قاضی ہنرمین ہی کہلاتے ہیں۔ اور ہنرمین ہمیشہ مسلمانوں میں سے منتخب کیا جاتا ہے۔

معزز ہندو تاجروں اور نوچی لوگ اسی طرح معزز گھرانوں کی خاتونیں بیان تک کہ وہ بھی جو کسی راجہ کی محبوبہ اور ملک کی ملکہ ہوں گے بیل کی لید (گوبر) سے بازاروں اور راستوں میں علانیہ آتی جاتی نظر آتی ہیں۔ اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا۔

اہل ہندو جانوروں کو ذبح نہیں کرتے بلکہ مڑوا رکھتے ہیں۔ بکری یا ٹائگر کا سر تلوار سے کاٹ ڈالتے ہیں۔ اور جب وہ مر جاتا ہے تو اس کا گوشت کھاتے ہیں۔ یہ لوگ جو بے بھی کھاتے ہیں۔ جو یہاں کی نہایت ہی لطیف غذا ہے۔

ایڈیٹر۔ بزرگ بن شہیار کے سفرنامہ سے ہم اسی قدر واقعات اخذ کر سکے۔ اس کے علاوہ اس میں جو واقعات مذکور ہیں ان کو ہندوستان سے تعلق نہیں لیکن ان باتوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی باتیں تو بالکل صحیح ہیں۔ اور بعض باتوں میں ہندوستان کے متعلق عبرت تاجروں میں غلط فہمیاں بھی تھیں ہندوستان ایسا ملک ہے جس میں صد ہا اقوام اور ہزاروں ذاتیں ہیں۔ اور ہر ایک کی معاشرت بالکل جدا۔ لہذا ان سیاحوں اور تاجروں میں سے اگر کسی نے کسی ایک شخص کو کوئی کام کرتے دیکھ لیا تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ عام ہندوستان میں مروج ہے۔ اور یہ لوگ اپنی غلطی سے اس پر قیاساً علم رائے قائم کر لیا کرتے ہوں گے۔

حسن کی کرشمہ ساریاں

غالباً دنیا کا کوئی حصہ اور کوئی ملک نہ ہوگا جہاں عورت اور مرد کے تعلقات

نے نئے نئے کرشمے نہ دکھائے ہوں۔ بیشک دنیا کی تاریخ اس سے بھر چکی ہوئی ہے کہ زبردست تاجداروں اور نامور پہلوانوں نے اپنے زور بازو اور اپنی شمشیر خراشنگان سے بڑی بڑی کسرش تو مون کو مغلوب و مقہور کر دیا مگر انھیں کے سلسلہ میں بہت سے ایسے واقعات بھی نظر آتے ہیں جن میں عورتوں نے اپنے حسن عالمگیر کی قوت اور اپنے دلربائی کے اسلحہ اپنی نظر کے تیردن اور گیسوؤں کی کندون سے اُن مشہور و معروف نامور دن کو بھی مغلوب و مقہور کر دیا جو بڑی سخت اور کسرش تو مون کو اپنا غلام اور تابع فرمان بنا چکے تھے۔ دکن از میں ہم اس قسم کی حسین عورتوں کے حالات کا ایک سلسلہ شروع کرتے ہیں جس سے ناظرین پروردن ہو گا کہ دنیا میں حسن زاہد فریب نے کیسے کیسے کرشمہ دکھائے ہیں اور کیسی کیسی فتحیں حاصل کی ہیں۔

(ملک مصر میں)

زنلیخا۔ یون تو ناز آفرینی و ناز برداری اور دلہن بانی و دل فروشی کی گرم بازاری عشق و محبت کے چراغ کو ہمیشہ اور ہر جگہ اُکساتی اور تیز کرتی رہتی ہے۔ مگر مصر کو اس بارہ خاص میں ساری دنیا پر ایک نمایاں فوقیت حاصل ہے۔ شعرائے عجم ترکوں کے حسن و جمال کی تعریف میں ہمیشہ رطب اللسان اور ایک ترک شیرازی کے خال ہندو پر ہر نقد و بخارا کو قربان کرتے رہے۔ مگر جستان کے حسن و جمال کا ایک زمانہ دیوانہ ہو رہا ہے۔ اور وہ کوہ قاف کی پر یان ہی ہیں جو صدیوں اور مدت ہائے دراز سے ایران و روم کے شاہی محلوں کی زیب و زینت بنی ہوئی ہیں۔ پتھر اجمی کی گویوں نے سری کرشن جی کی دیوتائی کی شان میں زندہ دلی کی جان ڈالی ہے۔ مگر نثر میں مصر نے اپنی نازنین مسند و شون کی دلربائی و دلفریبی کے جیسے جیسے کارنامے صفحات تاریخ پر درج کر دیے ہیں اور کسی ملک کو نہیں نصیب۔ کیونکہ زنلیخا اور قلوبطرحہ (کلومیٹرا) کی سنی نازنین دلبروں کو کسی ملک کی تاریخ نہیں پیش کر سکتی جنھوں نے دلبر ہی و دلستانی کو ایک فن بنا کے اُس میں انتہا درجہ کا کمال دکھا دیا۔

زنلیخا کے حالات کو یہاں تک شہرت و نمود حاصل ہے کہ تورۃ اور قرآن کے روحانی لٹریچر میں بھی انھیں جگہ ملی گئی۔ اور قلوبطرحہ کے واقعات مورخین روم کے

ذریعہ سے اس قدر مشہور ہوئے کہ آج ہر زبان کے مورخین کی زبان پر ہیں۔ اور
 متین سے متین اپنی تاریخ کے بیان میں بھی اُن کا تذکرہ آتے ہی ایک شاعرانہ
 رس اور مزہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اپنے حسن و جمال کے اثر اور اپنی سحر آفرین آنکھوں
 کے جادو بھرے تیرون سے کسی کے دل کو زخمی کر دینا ایک ایسا فن ہے جس میں
 ہر ملک کے حسین کمال رکھتے ہیں۔ اور ہر جگہ کے عشاق خسہ جگہ اپنے دلرباؤں
 کی بے رحمی کی شکایت کر رہے ہیں۔ رومی شاعر اودو کی غنوی ”ارٹ آف لو“
 (فن عشق با زمی) کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ روم کی ناز آفرین جہنمیں
 کس خوبصورتی سے دل چھین لیا کرتی تھیں۔ اور اُن کے ہاتھوں سے عشاق کیسے
 دل پرست ہو رہے تھے۔ مگر مصر کی یہ دونوں عالم حسن کی ہیروئین تھیں جنہوں نے ولستان
 کی معرکہ آرائیوں میں قیامت تک یاد رہنے والی فتین حاصل کی تھیں سب سے
 بڑا یہ امتیاز رکھتی ہیں کہ اپنے حسن کے موثر بنانے اور اپنے تیر نظر میں جاناگیر
 کی قوت پیدا کرنے میں اُنھوں نے جو کمال دکھایا اور کمین کی نازک اداؤں کا مین
 نہیں دکھاسکین۔

زلینجا کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت یوسف کو اُن کے نامہربان بھائیوں
 نے صحرائے عرب کے ایک اسماعیلی قافلہ داروں کے ہاتھ بیچ ڈالا تو وہ لوگ آپ کو
 لے کے مصر کے بازار حسن میں پہنچے۔ اور تظیف نام ایک مغز عمدہ دار مصر کے
 ہاتھ فروخت کر ڈالا جو دربار فرعون میں وزیر خزانہ کی خدمت پر مامور تھا۔ اور عزیز
 مصر کہلاتا تھا۔ عزیز نے حضرت یوسف کو لاکے اپنی بی بی کے سپرد کیا۔ جس کا نام
 مورخین سلف کے نزدیک تو راعیل تھا مگر خدا جانے کیونکر ایران و ہند کے متاخر
 شعرا و مورخین میں ”زلینجا“ مشہور ہو گیا۔ اور چونکہ اس مغز خاتون کا یہی نام ایران
 ہندوستان کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ لہذا ہم بھی اُسے اسی مشہور نام سے یاد

ع - توراہ اور قرآن مجید میں اس خاتون کا کوئی نام نہیں بتایا گیا ہے اور وہ
 ”عزیز کی جود“ یا ”امراۃ الغریز“ کے الفاظ سے یاد کی گئی ہے۔ عرب کے قدیم مورخ
 ابن اثیر وغیرہ اس محترم و مشہور خاتون کا نام ”راعیل“ بتاتے ہیں۔ مگر اب مسلمانوں میں
 اس کا نام ”زلینجا“ مشہور ہے۔

کرتے ہیں۔ عزیز نے حضرت یوسف کو اپنی بی بی کے خالے کرتے وقت یہ ارادہ ظاہر کیا تھا کہ چونکہ ہم لا ولد ہیں اس لیے اس خوبصورت کنعانی لڑکے کو بیٹا مانگے پالیں گے۔ جب آپ بڑے اور جوان ہوئے اور آپ کے حسن و جمال میں جوانی کی دلربائی نے جلوہ دکھا دیا تو زلیخا آپ کی صورت پر فریفتہ ہو گئی۔ اور اپنے دام میں گرفتار کرنے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کرنے لگی۔ مگر ایک معصوم پیرزادے کے قدم کو نفرتش ہونا غیر ممکن تھا۔ کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تب اُس نے مولانا جسامی کی روایت کے مطابق ایک مکان کو ایسے طریقہ سے سجا اور آراستہ کیا انسان کیسا ہی سہا جس ہو اُس میں قدم رکھتے ہی اُس کے دل میں ایک شورش عشق پیدا ہو جاتے۔ ہر طرف درد و یار میں ایسی تصویریں لگی ہوئی تھیں جنہیں دیکھ کے دل ہاتھوں سے جاتا رہتا۔ اور ممکن نہ تھا کہ انسان اپنے دل پر قابو رکھ سکے۔ اُس مکان کے اندر زلیخا یوسف کو تنہا لے گئی۔ سب دروازے بند کر لیے۔ اور کہاں بیٹا بی عشق کے ساتھ یوسف سے پست گئی۔ یہاں کے عالم کو دیکھ کے یوسف بھی از خود رنٹہ ہو گئے۔ قریب تھا کہ اُس کے دام زلف میں گرفتار ہو جائیں مگر ساتھ ہی ہنہر ہوا اور بے اختیار بھاگے۔ زلیخا نہایت ہی بیٹابی سے پیچھے دوڑی اور دامن پکڑ لیا۔ مگر یوسف نے ایسی بے اختیاری سے جھٹک دیا کہ دامن پھٹ کے اُس کے ہاتھ میں رہ گیا۔ وریہ دروازہ کھول کے باہر نکل پڑے۔

باہر نکلتے ہی عزیز کا سامنا ہو گیا جس نے دونوں کو اس حالت میں دیکھا کہ آگے آگے تو نہایت بدحواسی کے عالم میں یوسف ہیں۔ پیچھے اُس کی بورہ دہے۔ اور یوسف کا چٹنا ہوا دامن اُس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ دیکھ کے اُس نے وہ بوجھا رہ گیا۔ ادھر ان دونوں کا یہ عالم ہوا کہ ”خ“ کا ٹو تو لمونہ تھا بدن میں“ مگر زلیخا کی پُرفتن طبیعت اور پُرفتن فطرت نے اُسے سنبھالا۔ شوہر کی طرف دیکھ کے بے تحاشا چلائی ”تھار بھابی بی کے ساتھ جو کوئی بڑا ارادہ کرے اُس کی سزا قید کے سوا بھلا اور بھی کچھ ہو سکتی ہے؟“ یہ سُن کے یوسف میں تاب نہ رہی۔ بوسے ”خود ہی تو میرے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔ اور اُسے مجھی کو الزام دیتی ہیں میں جان بچا کے بھاگا تو میرے پیچھے دوڑیں اور میرا دامن چھاڑ دیا۔“ اب عزیز مہر مہر

تھا کہ کیا فیصلہ کرے اور کسے الزام دے کہ اُس کا چچا زاد بھائی جو اتفاقاً اُس کے ساتھ تھا بولا ”کُرتے ہی کے دیکھنے سے دونوں کا جھوٹ سچ کھل جائے گا۔ اگر یوسف کے کُرتے کا اگلا دامن پھٹا ہو تو جانے کہ زلیخا سچی ہیں اور یوسف جھوٹے ہیں۔ اور اگر کچھلا دامن پھٹا تو سمجھ لینا چاہیے کہ یوسف سچے ہیں۔ اور یہ جھوٹی ہیں۔“ اُس تجویز کے مطابق کُرتے کا جو معاملہ کیا گیا تو نظر آیا کہ کچھلا دامن پھٹا ہوا ہے۔ اس ثبوت کے ہم پہرہ بچتے ہی زلیخا کا سر نہ امت سے جھک گیا۔ اور عزیز نے بی بی کی طرف دیکھ کے کہا ”یہ تمہارا ہی فریب ہے۔ سچ یہ ہے کہ تم لوگ بڑے ہی مکار چوکے ہو۔“ بی بی کو سن کر کیا دیتا ہے اور پھر عزیز کا سنا کارہ آدمی جس کی نسبت مشہور تھا کہ عورتوں کے کام ہی کا نہیں ہے اس واقعہ کو اتنے ہی پر مثال دیا کہ زلیخا سے کہا ”بی بی سارا قصور تمہارا تھا۔ لے اب اپنے گناہ سے توبہ کرو۔ اور پھر ایسا نہ ہو۔“

یہ تو پہلا موقع تھا جبکہ زلیخا نے اپنے حُسن و جمال کے اثر۔ اپنے ناز و انداز اور اپنے کمال و برتری سے ایک پیہر زادے کے دل پر فتح پانے کی کوشش کی تھی۔ مگر چونکہ پیہری کے دامن عفت میں دھبہ لگانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ بالکل کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ لیکن ایک دوسرے موقع پر جب اُس نے حُسن کی کرشمہ سازی ان دکھانے کے ہنرمین کمال چابکدستی دکھا کے اس بات کی کوشش کی کہ حُسن یوسف کا اثر تمام بری دش خاتون مصر کے دلوں پر ڈال دے اور اپنے آپ کو معذور ثابت کرے پوری طرح فتیاب ہوئی۔

یہ سین بھی نہایت ہی دل فریب تھا۔ اور سوا مصر کی سرزمین کے اور کہیں شاید نہ نظر آیا ہو گا۔

اس کی بنیاد یہ تصور تھا کہ دل ہاتھ سے دے بیٹھے کا حال جب اُس اے مصر کے گھروں میں مشہور ہوا اور تمام مغز خاتونیں اُن نگلیوں کو دانتوں سے کاٹ کاٹ کے زلیخا کو الزام دینے لگیں کہ ”دلی شوق پورا کرنے کے لیے ایک غلام ہی تھا۔ زلیخا کو کوئی شریعت زادہ نہ ملتا تھا؟“ تو اپنے سر سے یہ الزام اُٹھانے کے لیے زلیخا نے ایک دن تمام خاتونان مصر کی دعوت کی جس میں بڑا ہی تکلف کا سامان کیا۔ دو کمرے

نہایت دوہمندی سے آراستہ کیے۔ جدھر نظر جاتی سونے کی جھالریں جھلک رہی تھیں۔
 زرد و مخمل کا فرش بچھا یا گیا تھا۔ ہر طرف دیبا و حریر کے پردے لٹکائے گئے تھے۔ اور انکی
 آراستگی میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا گیا تھا۔ پھر ایک کمرے میں اُس نے چابکدست
 مشاطوں کو حکم دیا کہ یوسف کو بنا چنا کے دو لٹا بنا دیں۔ آپ کے بالوں میں کنگھی
 کر کے موتی پروئے گئے۔ حریر زرد کے کپڑے پنچائے گئے جس میں سنہرے روپے
 اور سرخ گل بوٹوں پر سنہرے رنگ کی چھوٹی چھوٹی چڑیاں بٹھائی گئی تھیں۔ اطلس
 سرخ کا پانچواں اور سر پر موتیوں اور جواہرات کا مرصع تاج پہنایا۔ اُس تاج کے نیچے
 سے آپ کی خم در خم زلفیں نکلی ہوئی تھیں جو پیشانی پر مار پچان کی طرح جل کھانے
 کے بعد چہرے کے گرد اگرد چکر کھاتی ہوئی سینہ پر ٹکادی گئی تھیں۔ ادھر ادھر دونوں
 رخساروں پر دو زلفیں بھون گئے ڈنک کی طرح مناسب تم کے ساتھ نکال دی گئی تھیں اور با
 زلفیں بیٹھ پر بکھری ہوئی تھیں جن میں موتی گوندھ کے اور طلائی موباف ڈال کے عجیب
 پر لطف جال شانوں اور بیٹھ پر پھیلا دیا گیا تھا۔ دونوں کا نون میں دو اعلیٰ درجہ
 کے موتیوں کے گوشوارے پڑے تھے۔ گلے میں طلائی مرصع طوق تھا۔ کمر میں سونے کا
 ٹیکا تھا جس میں یا قوت کی گھنڈیاں اور موتیوں کی جھالریں لگی تھیں۔

جب حضرت یوسف اس طرح بنائے چنائے اور سنوارے جا چکے تو
 دوسرے اُس سے زیادہ پرتکلف کمرے میں دسترخوان بچھا یا گیا۔ جس پر تمام
 حسین و ناز آفرین معانوں نے بیٹھ کے ہر قسم کے الوان نعمت کا لطف اٹھایا۔
 اس کے بعد جام شراب کا دور چلا۔ اور شراب کے بعد جب میوہ خوری کا وقت
 آیا تو ہر خاتون مصر کے سامنے ایک ترنج اور ایک چھری لاکے رکھ دی گئی۔ تاکہ
 انھیں کاٹ کے کھائیں۔ ابھی وہ بھلون کو کاٹنے نہیں پائی تھیں کہ زلیخانے اُن
 سب خاتونوں کی طرف متوجہ ہو کے کہا۔ ”بی بیو۔ میں نے سنا ہے کہ ایک غلام
 کے متعلق تم سب مجھے الزام دیتی ہو۔ کیا یہ سچ ہے؟“ سب نے کہا ہاں سچ ہے
 ہمارے خیال میں آپ کا حسن و جمال اس مرتبہ کا ہے کہ اُس پر بادشاہوں اور
 شاہزادوں کی نظر بن پڑنی چاہیے تھیں نہ یہ کہ ایک غلام پر فریفتہ ہو کے آپ
 اپنی بے قدری کر دیں!“ زلیخانے کہا ”مگر تم اس امر کا صحیح اندازہ نہیں

کر سکتی ہو۔ پھر حکم دیا کہ مغرب کی طرف کے زر بعت کے پردے اٹھا کے حضرت یوسف لائے جائیں۔ مشاطائیں اُسی شان و رعنائی سے یوسف کو اندر لائیں۔ صبح کا وقت تھا اور اس کا پہلے سے انتظام رکھا گیا تھا کہ یوسف جیسے ہی اس کمرے میں داخل ہوں اُن کے چہرے پر آفتاب کی شعاعیں پڑیں چنانچہ آپ لائے گئے۔ سورج کی نرم شعاعوں نے چہرے پر سنہرا پانی پھیر کے آپ کے حسن کو اور چمکا دیا۔ یہ معلوم ہوا کہ آسمان سے کوئی فرشتہ اتر آیا ہے یا آسمانی حسن و دنیا میں جلوہ افروز ہو گیا۔ ساری خاتونیں مبہوت اور بت بن کے رہ گئیں۔ زینحائے کہا "کیون کیا ہوا؟ یہ تم باتیں کرتے کرتے ٹک کیون گئیں؟" سب نے جواب دیا: "یہ انسان نہیں فرشتہ ہے۔" اس کے بعد سب نے ترجیح کاٹنے کا قصد کیا تو بے اختیاری وہ بے خودی میں ترنجوں کے عوض اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کے زینحائے بولی "یہی وہ غلام ہے جس کے بارے میں مجھے الزام دیا جاتا ہے۔ اور یہی ہے جس پر تم سب مجھے لعنت ملامت کرتی تھیں۔ مگر تمہیں انصاف کرو کہ ایسے جوان رعنا کو انسان چاہے نہ تو کیا کرے؟" اب سب نے زینحائے کی معذوری تسلیم کر لی۔ تو زینحائے اُن سے التجا کر کے کہا "جب تمہارا یہ خیال ہے تو خدا کے لیے اسے سمجھا بچھا کے راضی کرو۔" اب سب عورتوں نے اٹھ اٹھ کر حضرت یوسف کو فریب دینا شروع کیا اور ہر بچاے اس کے کہ وہ زینحائے کو کالت کرتیں۔ آپ کو خود اپنی طرف مائل کرنے لگیں۔ مگر بظاہر زینحائے ہی کی سفارش کر رہی تھیں۔

در حقیقت یہ بھی نہایت ہی موثر سین تھا کہ حضرت یوسف سچے سچا لے دو طاب بنے ہوئے خاموش کھڑے ہیں۔ اور مصر کی ساری حسین و پر ہی جمال عورتیں لباس فاخرہ اور زیور پہنے اور ہر قسم کا بناو چناؤ کیے ہوئے آپ کو یا تو زینحائے کی طرف متوجہ کرتی ہیں اور یا اپنے دام میں پھانسا چاہتی ہیں۔ بے شک یہ زینحائے کا پہلے سے بھی بڑھا ہوا فریب تھا۔ مگر سمیرا نہ عصمت اس پر بھی غالب آئی۔ اور کسی کا زور نہ چلا۔ یہاں تک کہ زینحائے جب بالکل عاجز و مایوس ہوئی اور کوئی زور نہ چلا تو آپ کو قید خانہ میں بھیج دیا۔

عربی زبان اور اُس کی نحو و صرف

آج کل دنیا کی مشہور و متداول زبانوں میں سے اکثر یا تو خالص آریہ قوم کی زبانیں ہیں یا آریوں کی زبان سے نکلی ہیں۔ مگر دنیا میں روز بروز ثابت ہوتا جاتا ہے۔ کہ آریہ قوم کے عروج سے پہلے ساری مہذب دنیا میں بنی سام کا دور دورہ تھا۔ اور انھیں کی زبان اطراف عالم پر چھائی ہوئی تھی۔

اُن کی زبانیں سریانی، کلدانی، عبرانی۔ اور غالباً قبلی تھیں۔ اور مشرق میں بابل و نینوا کا زور و شور ہوا اور مغرب میں فرعون مصر کا تو ساری دنیا کی تہذیب و تمدن کا مرکز یہی سامی زبانیں بن گئیں اور انھیں کے علم و ہنر کے بارغ سے آ کے یونانیوں نے خوشہ چینی کی۔

مگر ان سلطنتوں اور قوتوں کے فنا ہوتے ہی آریہ قوم اور اُس کی زبان کا عروج شروع ہوا۔ اور بنی سام کی زبانیں مغلوب اور دنیا سے معدوم ہونے لگیں۔ اس انقلاب میں بنی سام کی اور زبانیں تو سب مٹ گئیں یا ٹٹنے کے قریب ہیں۔ اور اگر ہیں بھی تو گننام اور بے نام و نشان۔ فقط ایک عربی زبان باقی ہے جو سب کی وارث ہے۔ اور جس نے آریوں کے غالب آنے کے بعد اُن کو مغلوب کیا۔ اور اُن سب اپنا سکہ جما دیا۔ یہی حضرت سلیمان کے جاہ و جلال اور حضرت یوسف کے حسن و جمال کو یاد دلاتی ہے۔ اور یہی بابل و اسیریا کے درباروں کی یادگار ہے۔ یہی ملک سبا اور بتا بعل میں کی ترقیوں اور عالمگیروں کا افسانہ سناتی ہے۔ اور یہی صائبین کے علم و فضل اور کمالات روحانی کی خبر دینے والی ہے۔ اس بحث سے بھی قطع نظر کر لیجیے کہ یہ عبرانی سے نکلی ہے یا عبرانی اس سے۔ اور اس ذکر کو بھی کو جانے دیجیے کہ عبرانی زیادہ قدیم ہے یا عربی۔ (جس میں کہ فاضل زمانہ جسٹس مولانا سید کرامت حسین صاحب حج ہائی کورٹ الہ آباد نے بہت کچھ بحث کی ہے) مگر یہی کیا کم ہے کہ جو اثر و نیا اور دنیا کی زبانوں پر عربی زبان نے ڈالا اور جیسا بقائے دوام عربی کو حاصل ہو گیا ہے نہ کسی اور شہک زبان کو نصیب ہوا تھا اور نہ کسی آریہ زبان کو۔

عربی کے مقابلہ کی زبانیں صرف سنسکرت۔ یونانی اور لاطینی ہیں۔ جو

آرین اسٹاک کی زبانیں سمجھی جاتی ہیں۔ مگر وہ سب دوسری نوزائیدہ زبانوں میں اپنے الفاظ پر نشان چھوڑ کے دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ سنسکرت کے اثر کا حلقہ سرحدیں سے لے کے ایدان کی مغربی سرحد تک ہے۔ جس میں بیسیوں زبانیں ہیں۔ اور سب سنسکرت کی بیٹیاں ہیں۔ کیونکہ وہ ہر صوبہ کے اصلی باشندوں کی زبان اور سنسکرت کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہیں۔

ایران سے حدود شام تک بابل و بینو کی قدیم سنگ زبان کا حلقہ تھا اور وہاں سے آگے بڑھ کر استانی حدود مغرب تک یعنی مغربی حصہ ایشیا اور سارے یورپ میں یونانی اور لاطینی زبانوں کا دخل و دخل تھا۔ جہاں کے لوگوں کی اصلی زبانوں پر ان دونوں زبانوں نے حکومت کر کے نئی زبانیں مروج کیں۔ جو آج کل یورپ کی ترقی کے ساتھ اوج کمال پر پہنچ رہی ہیں۔ ان دونوں زبانوں پر جو آرین اسٹاک کی زبانیں تھیں بحیرہ روم کے جنوبی ساحل پر اتر کے افریقہ پر بھی اپنا اثر ڈالا جہاں کہ فراعنہ کی قدیم نبطی زبان کا اثر پڑا ہوا تھا۔

غرض دنیا کی یہ حالت ہو رہی تھی کہ مشرق میں سنسکرت اور اُس کی سگی بہن پہلوی زبانیں اپنی نو عمر بیٹیاں چھوڑ کے مرچکی تھیں۔ بائبل اور اسیریا کی زبانوں کا بھی چراغ گل ہو چکا تھا۔ جنوب میں فراعنہ کی زبان کا نام و نشان بھی نہیں باقی رہا تھا۔ مغرب میں یونانی اپنے مصنفوں کے ساتھ قبر میں دفن ہو چکی تھی۔ اور لاطینی دین عیسوی کی مقتدائی کا عصا ہاتھ میں لے کے بڑھاپے اور کسروی کی گھڑیاں پوری کر رہی تھی کہ عربی اپنے وطن کے پہاڑوں اور بالو کے ٹیلوں سے نکل کے تمدن دنیا میں آئی۔ اور چند روز میں اقوام عالم کے ساتھ السنہ عالم پر بھی چھا گئی۔

اسلام سے پیشتر عربی زبان جزیرہ نما عرب کی حدود کے اندر بند تھی۔ اگرچہ جنوبی عرب کی حمیری زبان جو عربی ہی کی ایک شاخ تھی کسی قدر تمدن زبان تھی۔ اور قدیم الایام کے بڑے بڑے کارناموں اور حیرت انگیز ترقیوں کی جنوبی تھی۔ یہاں تک کہ اُسی کی برکت سے ارض حبشہ کی موجودہ زبان پیدا ہوئی ہے مگر شمالی عربی یعنی ارض حجاز کی لغت قریش نے یہاں تک دینی دنیوی عروج حاصل

کیا کہ اُسے بھی مغلوب کر کے اپنا بنا لیا۔

نیر اسلام کے طلوع سے پہلے عربی زبان میں صحیح سے اختلافات تھے۔ بلکہ یون کسنا چاہیے کہ ہر بڑے قبیلہ اور ہر حصہ عرب کی زبان جدا گانہ تھی۔ مگر یہ اختلافات صرف محاورات یا بعض حروف کے مخارج اور طرز ادا میں تھے یعنی یہ نہیں کسا جاسکتا تھا کہ کوئی دوسری زبان عرب میں بولی جاتی تھی۔ یا اتنا مشرق تھا کہ ایک صوبہ کی زبان کو دوسرے صوبہ والے سمجھ نہ سکیں۔ اس زبان میں فصاحت بھی تھی بلاغت بھی تھی۔ مگر عالم کی نظر سے چھپی ہوئی۔ اپنی سسانی خوبیوں کی قدر کرنے والے وہ خود آپ ہی تھے۔ دوسری قومیں ہنوز تیار نہ تھیں کہ ان کی فصاحت اور جادو بیانی کی داد دے سکیں۔ ان دنوں اطمار فصاحت کے میدان یا چند میلہ اور بازار تھے جہاں قبائلی عرب تمدنی اغراض سے جمع ہو جاتے تھے۔ یا عرصہ ہاے کارزار تھے جہاں وہ اپنی شجاعت و جوانمردی کا نغمہ خود ہی سناتے اور خود ہی سر دھن لیتے اور اپنی پُراثر رجز خوانی سے اپنی رگ حیت کو جوش میں لاتے۔ یا شاہان یمن و حیرہ و بقا کے دربار تھے جہاں قصیدہ خوانی کر کے وہ کچھ دولت حاصل کر لیتے یا کسی عزیز و قریب کے دوست کی لاش تھی جس پر کھڑے ہو کے مرثیہ خوانی کرتے۔ یہ وہ مقامات تھے جہاں ان کی نظمیں سُنی جاتیں۔ رہی نثر اُس میں ان کے کمالات کبھی تو کسی کاہن یا کاہنہ کی گفتگو میں نظر آتے کبھی کسی اخلاقی حکیم کے ہندو نصائح میں۔ اور کبھی کسی خطیب کے برجستہ خطبوں میں۔

مگر یہ لٹری خزائن ابھی تک صرف دماغوں اور حافظوں میں محفوظ تھے۔ کیونکہ کوئی خط نہیں ایجاد ہوا تھا۔ صرف ایک جمیری خط جنوبی عرب میں تھا۔ جس سے تصنیف و تالیف کا کام نہیں لیا گیا تھا۔ اس سے اگر مدد لی جاتی تھی تو صرف خط و کتابت اور نامہ و پیام میں۔ قریش میں آن حضرت صلعم کی ولادت سے چند ہی روز پہلے ارض حیرہ یعنی ایران کے سرحدی صوبہ عرب سے ایک رسم خط حاصل کیا گیا تھا۔ جس کے جاننے والے چند گنتی کے اہل مکہ تھے۔ آپ کی تعلیم نبوت کے ساتھ ہی ساتھ اس خط کو فروغ ہو جس کے وہ ایک نمونہ یورپ کے عجائب خانوں میں موجود ہیں اور ان کے فوٹو جا بجا مل سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں

کہ موجودہ عربی رسم خط کا نقش ادلیں وہی تھا۔ مگر اس قدر ناقص اور غیر مکمل کہ نہ نقطہ بین اور نہ اعراب۔

اب قرآن نازل ہوا۔ اور اُس کے لکھنے اور نیز تعلیم و تلاوت کی لازمی ضرورت سے اس رسم خط نے خود بخود ترقی کرنا شروع کی۔ ابتدائی فتوحات کے وقت جب عرب۔ ایران۔ شام۔ روم اور مصر وغیرہ کی فتوحات و ملک گیری میں مشغول تھے انھیں سوا، اعلا، کلمۃ اللہ کی دھن کے اور کسی بات کا خیال نہ تھا۔ رجز خوانی اور مرثیہ گوئی تو اہل بیت تھی باقی اور سب طرح کی نظمیں کا بازار سرد تھا۔ ہاں افسران فوج سے ملت کرانے کی ضرورت سے ایک خاص قسم کی سادی انشا پر دوازی ترقی کرنے لگی تھی جس کی فصاحت و بلاغت کا معیار صرف نظم قرآنی کا متبع تھا۔

فتوحات کے بعد ضرورت ہوئی کہ شرفاے عرب جو مدت دراز تک جہاد میں مصروف رہے رٹاڑ ہوئے تھے اور صحراے عرب کی تلخی و ترشی کی معاشرت آشنا ہو گئے تھے ایسے مقامات پر آباد کیے جائیں جو نہ عرب سے باہر اور دور ہوں اور نہ دشت عرب کے اندر واقع ہوں۔ اور جہاد و فوج کشی کی ضرورتیں بھی اس بات کی متقاضی تھیں کہ نو مفتوح ممالک کی سرحدوں پر عربوں کی نوآبادیاں قائم کر دی جائیں تاکہ ضرورت کے اوقات میں بہت جلد اسلامی لشکر مرتب کر لیے جاسکیں اور وہ چند ہی منزلوں کی مسافت طے کر کے رزم گاہ میں پہنچ جایا کریں۔ خصوصاً جب عرب خاندان بلاد و در دراز میں جا جا کے آباد ہونے لگے تو اس کی ضرورت اور زیادہ محسوس ہوئی۔ اسی ضرورت سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں عراق کی سرحد پر کونہ اور بصرے کی نوآبادیاں قائم ہوئیں۔ جہاں اُن تمام شرفاے عرب نے جو ایران سے لے کے سندھ اور ترکستان تک جو ہر سپہ گری دکھا چکے تھے سکونت اختیار کی اور اپنے گھر بنا کے رہنے لگے۔

ایسی ہی عربی بستیوں دمشق اور اسکندریہ کے پاس بھی قائم ہو گئی تھیں۔ مگر اطلینان سے بچنے کا جیسا موقع کونہ اور بصرہ والوں کو ملا کہیں کے عربوں کو نہیں ملا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مشرق کی طرف کوئی ایسی سلطنت نہیں باقی رہی تھی جو اسلامی سلطنت کے مقابل صفت آرا ہونے کی جرأت کر سکتی۔ بخلاؤں اس کے

دشمن روم کی مشرقی سلطنت کی سرحد پر تھا جس سے چھ سات سو برس تک اسلامی سلطنتوں سے لڑائیاں ہوتی رہیں۔ اور اس کے عربوں کا درخ افریقہ کی طرف تھا جہاں روزے نئے پید ا ہوتے تھے۔ اور جدھر سے آبنائے جبرالٹر کا نالہ بچاند کے اُٹھون نے گاتھک سلطنت کا خاتمہ کیا اور یورپ کے جنوب و مغربی حصہ میں اپنی سلطنت قائم کر لی۔

عراق یعنی کوفہ و بصرہ کے عربوں کی فارغ البالی کا ایک بڑا سبب حضرت علی اور جناب معلویہ کی لڑائیاں بھی ہوئیں۔ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی میں کوفہ والوں نے کبھی پورے جوش اور سچے دل سے آپ کا ساتھ نہیں دیا۔ اور آپ کی شہادت کے بعد جب بنی امیہ کی سلطنت قائم ہو گئی تو اُٹھون نے اُن لوگوں کو فطرتاً بے وفا خیال کر کے یا یہ سمجھ کے کہ یہ لوگ ہمارے سچے دوست نہیں ہو سکتے ان سے لشکر کشی اور معرکہ آرائی میں بہت کم کام لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کوفہ اور بصرہ والوں کو میدان جنگ کے شغلوں سے فراغت حاصل ہوتے ہی زبان عرب تو اعدا مضبوط کرنے اور لڑائی مشاغل میں مصروف ہو جانے کا پورا موقع مل گیا۔ چنانچہ سب سے پہلے جو شہر عربیت کے مستند اسکول بنے یہ دونوں شہر کوفہ اور بصرہ تھے۔ جن پر مباحثہ نحوی و صرفی اور فصاحت و بلاغت کے مسائل میں آج تک اسناد کیا جاتا ہے۔

سب کے پہلے ابوالاسود دؤلی نے علم نحو کی تدوین کی بنیاد ڈالی۔ جو بصرہ میں اقامت گزین تھے۔ ابوالاسود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صحبت یافتہ آپ کے شاگرد اور کبار تابعین میں تھے۔ حضرت علی نے اُن کو زبان عرب کے چند قواعد کی تعلیم دی تھی۔ اُن قواعد کو ضروری اور نہایت قیمتی خیال کر کے ابوالاسود نے جناب امیر کی خدمت میں عرض کیا کہ ”اضح نحو اصنع“ نحو کے معنی مثل کے ہیں۔ مطلب یہ کہ ”اجازت ہو تو جیسے قواعد آپ نے بنائے ہیں ویسے ہی میں بھی بناؤں“ حضرت علی نے اجازت دی۔ اور ابوالاسود نے چند اور قواعد بنائے اور اُسی لفظ نحو کی روایت سے اُس فن کا نام نحو رکھ دیا۔

ابوالاسود ابتداً اُن قواعد کو لوگوں سے چھپاتے اور قیمتی جواہرات کی طرح

حضرت علیؑ اجازت دی۔ اور ابوالاسود نے چند اور قواعد بتائے۔ اور اسی لفظ نحو کی رعایت سے اُس فن کا نام بھی دستخط رکھ دیا۔

ابوالاسود ابتداً اُن قواعد کو لوگوں سے چھپاتے اور قیمتی جواہرات کی طرح پوشیدہ رکھا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ زیادہ سے جواہر ابوالاسود کی زبانِ انانی سے واقف نہا اپنے عہدِ حکومت عراق میں انھیں بلا کے کہا: ”آپ کچھ ایسی باتیں قلمبند کر دیجیے جس سے لوگوں کو کتاب اللہ کی تعلیم میں مدد ملے۔“ ابوالاسود نے صاف جواب دیا کہ: ”مجھے صاف رکھیے،“ اور اپنے گھر چلے آئے۔ لیکن اس کے چند ہی روز بعد دوا سے واقعہ پیش آئے کہ انھیں اپنی شد چھوڑنی پڑی۔ ایک مرتبہ تو یہ دوا کس فارسی قرآن کو تلاوت کرتے بنا جو آیہ کریمہ ”إِنَّ اللَّهَ بَرُّهُی الْمَشْرِکِیْنَ وَرَسُولُهُ آمِنٌ رَّسُولُکُمْ“ کی جگہ ”رسولہ“ پڑھ گیا۔ آیت کا اصل مطلب تو یہ تھا کہ ”خدا اور رسول مشرکوں سے بری الذمہ ہیں“ مگر اعراب کی اس غلطی سے یہ مطلب ہو گیا کہ ”خدا مشرکوں اور اپنے رسول سے بری الذمہ ہے“ سنتے ہی ابوالاسود کانپ گئے۔ اور کہا: ”میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ لوگوں کی یہ حالت ہوئی ہے۔ دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ ”دوسعد“ نام ایک فارسی الاصل نو مسلم شخص نے ابوالاسود کے کسی سوال کے جواب میں ایک ایسا فقرہ کہا جس میں ”وہ ان“ کی خبر کو بجائے زیر کے پیش دے دیا۔ جس پر تمام گرد و پیش کے لوگ ہنس پڑے۔ اور ابوالاسود نے کہا: ”ان غلاموں نے دین اسلام اختیار کیا اور ہمارے بھائی بن گئے ہیں۔ بہتر ہو گا کہ ہم انھیں زبان کی تعلیم دیں۔“

ملک کے بہترین جدید تصانیف

معرکہ مذہب و سائنس۔ انگریزی زبان کے عالی مرتبہ مصنف اور گران پایہ محقق ”ڈیویز“ کو جو شہرت و ناموری حاصل ہے محتاج بیان نہیں۔ اور اُس کی کتاب ”دکانِ فَلَکِلیت“ بیوین رلیجن اینڈ سائنس، علمی دنیا میں جس دقت و ادب کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے اُس سے بھی زمانہ بخوبی واقف ہے۔ مگر اس کتاب کی آخری بہت بڑی فضیلت یہ ہے کہ اسے اردو کا مترجم بھی اس پایہ کا نصیب ہوا جیسا کہ خود مصنف تھا۔ مولوی ظفر ملتان

صاحب بی۔ آسے کی مٹری قابلیت علمی وقعت اُن کے اعلیٰ ذوق انشائیہ دازبی اور اُن کے لکھنے ہوئے سچے اور مقبول عام مذاق سخن سے اردو کا کوئی پڑھا لکھا شخص نہ ہوگا جو واقف نہ ہو۔ اور دراصل اُن کا اردو پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی علمی کتاب کو انھوں نے فصیح و بلیغ اردو کا لباس پنھا کے شایع کر دیا۔ جو ۲۰ x ۲۶ پیمانہ کے ۴۸۷ صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔ کاغذ عمدہ ولایتی لگایا گیا ہے۔ اور چھاپی نہایت صاف واضح اور روشن ہے۔ اصل کتاب کے صفحات کے علاوہ ابتدا میں ۹ صفحوں پر کتاب کی مفصل فہرست ہے۔ جس میں سائنس کی ابتدا مسیحیت کے آغاز۔ سائل توحید۔ ماہیت روح۔ ماہیت عالم۔ عمر زمین۔ معیار حق۔ اور نظام عالم۔ کے متعلق مذہب اور سائنس کی نزاعوں سے مفصل اور عالمانہ و محققانہ بحث کی گئی ہے۔ اور آخری تین بابوں میں لاطینی مسیحیت اور سائنس کے ساتھ تمدن جدید کے تعلقات۔ اور جو خطہ کہ اب آنے والا ہے اُس کو بیان کر کے کتاب ختم کر دی گئی ہے۔ فہرست کے بعد مشہور فاضل زمانہ مولوی محمد عبدالحق صاحب بی۔ آسے کا ایک مقدمہ ہے جو ۹ صفحوں پر ختم ہوا ہے اور نہایت ہی قابلیت اور دقت نظر سے لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد خود مترجم صاحب نے ۱۲ صفحوں پر مصنف کی لائف لکھی ہے۔ اور ۱۳ ہی صفحوں پر خود مصنف کے دیباچے کا ترجمہ ہے۔ ان ترمیمی چیزوں کے بعد اصل کتاب شروع ہوئی ہے۔ جس کے صفحات ہم بتا چکے ہیں۔ الغرض نہایت ہی نادر و بے مثل کتاب ہے جیسی کہ اردو کو کم نصیب ہوتی ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ انجمن آردو حیدر آباد دکن نے اس کتاب کو اپنے سلسلہ مطبوعات میں لے کے قوم کی طرف سے قدر دانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ یہ کتاب نواب محسن الملک بہادر مرحوم کے نام سے ڈیڑھ لاکھ کی گئی ہے۔ اور افسوس کہ آج جب یہ پبلک کے پر شوق ہاتھوں میں آئی ہے اسکے وہ سچے قدر دان دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔

نفس کتاب کے متعلق کوئی بیسٹرا سے ظاہر کرنے کے لیے ہم تیار نہیں ہیں۔ اگر اتنا ضرور کہیں گے کہ مصنف کے پیش نظر جس قدر مذہب عیسوی ہے دیگر مذاہب نہیں۔ اور اسلام کے متعلق جو غلط افواہیں عالم مسیحیت میں مدت ہلے دراز سے مشہور چلی آئی ہیں اُن کے اثر سے ستر ڈیڑھ لاکھ کی غالی نہیں ہیں۔ مگر اُن کی اصلاح مترجم صاحب نے اپنے پرجوش نوٹوں میں بڑی قابلیت سے کی ہے۔ یہ کتاب دو قسم کے کاغذوں پر

بچھی ہے۔ قسم اول کی قیمت للہ اور قسم دوم کی ہے۔ علاوہ محصول ڈاک ہے۔ مجلد نفع بھی موجود ہیں۔ جو اول درجہ کے کاغذ والے صر کو اور دوسرے درجہ کے کاغذ والے صر کو ملے ہیں قیمت اس کی حالت کے لحاظ سے زیادہ نہیں۔ ہم کو یقین ہے کہ جن حضرات کو علم کا شوق ہے۔ خصوصاً تعلیم یافتہ حضرات اس کی ضرورت فرمائیں گے۔ درخواستیں مولوی ظفر علی خان صاحب جی۔ آسے ایڈیٹر زمیندار کے پاس دو کرم آباد۔ پنجاب۔ کے پتہ پر بھیجی جائیں۔

قدیم ہندوستان کی تہذیب۔ مسٹر آر تھی۔ دت کی تاریخ ”سولینر لیشن آف اینڈنٹ انڈیا“ کا ترجمہ۔ اس کتاب کو بھی بہت کچھ شہرت حاصل ہے۔ اور محققین تاریخ کی نظر میں بڑی وقعت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ مسٹر ایم۔ آسے ولایت احمد صاحب مقیم جے پور نے بڑی قابلیت اور محنت سے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ جو ایک پڑنے مشہور مذاق علم رکھنے والے ہیں۔ اور ہم مسٹر ولایت احمد صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انھیں بالخصوص اور نہایت ہی صاف اور سلیس ترجمہ کرنے میں پور کوشش حاصل ہوئی ہے۔ یہ کتاب جیسی خوبی سے ترجمہ کی گئی ہے اسی کے مناسب اہتمام سے ۲۶ x ۲۹ سائز کے اوسط درجہ کے گنڈہ کاغذ پر طبع بھی ہوئی ہے۔ لکھائی اور چھاپائی بہت صاف واضح اور روشن ہے۔ ابتدا میں خود مصنف مسرت کا فوٹو ہے۔ اُس کے بعد مترجم صاحب کا۔ جو متین و ذہین پنجتہ مغز مسلمان کی شان سے عامہ باندھے شہر والی پٹنے اور غالباً اسی کتاب ”سولینر لیشن آف دی انڈینٹ انڈیا“ کی ایک کاپی سینہ سے لگائے ہوئے کھڑے ہیں۔

ابھی صرف اس کتاب کی پہلی جلد کا ترجمہ شایع کیا گیا ہے۔ دوسری جلد کا ترجمہ قابل مترجم صاحب اُس وقت شایع فرمائیں گے جب ملک اس جلد کی قدر دانی کا ثبوت دے دے گا۔ اور ہمیں یقین ہے کہ ملک کے روشن خیال قابل و فاضل اور تعلیم یافتہ قدر دان علم اس کی ضرورت فرمائیں گے۔

اس ایک ہی حصہ کا ترجمہ کرنے سے ہندی تہذیب نے مترجم صاحب پر اتنا اثر کر لیا ہے کہ کتاب کے خاتمہ پر اپنے اعلانیں ہماری طرف بجا سے ”صاحبو!“ یا ”حضرات“ کے ”ماہانینو!“ کے لفظ سے خطاب فرماتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ دوسرا حصہ انھیں

اس قابل بنادے گا کہ جس طرح وہ ہمیں "مہاشا" کہتے ہیں اس طرح ہم انھیں مہاشاؤں کی مانند سمجھ سکتے ہیں۔ کتاب کی قیمت نہ کہیں ہمیں لکھی ہوئی نظر آئی اور نہ ہمیں بتائی گئی ہے۔ مگر نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی قابل قدر کتاب ہے۔ ہمارے احباب مصنف صاحب سے "بے پور" کے پتہ پر مراسلت فرما کے ضرور طلب فرمائیں۔

پنجاب ریویو۔ اگست ۱۹۱۰ء سے اردو کے علی خزانے میں ایک اور قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ شاید بہت سے لوگ "دکن ریویو" کو یاد کر کے اس کے موجود نہ ہونے پر افسوس کرنے لگتے ہوں گے جو مولوی محمد ظفر علی خان جی۔ آسے کی ایڈیٹری میں حیدر آباد دکن سے شائع ہوتا تھا۔ اب ہم انھیں خوش خبری سناتے ہیں کہ اس کے عوض پنجاب ریویو جاری ہو گیا جو انھیں قابل ہاتھوں میں ہے۔ اور جس سے امیدوار پنجاب کی سرزمین میں جو لٹریچر کے حق میں روز بروز سیر حاصل ثابت ہوتی جاتی ہے پہلے سے زیادہ اور بہت نمایاں ترقی کرے گا۔ پنجاب ریویو کا سائز ادیب الہ آباد کی طرح ۲۰ x ۳۰ پیمانہ کا ہے۔ اور اسکی صفحات علاوہ ٹائٹل کے ۵۲ صفحہ کی ہے چھپائی اور کاغذ اعلیٰ درجہ کے ہیں اور مضامین بھی وعدہ کر رہے ہیں کہ عنقریب یہ رسالہ بہت اچھے علمی مذاق کو ترقی دے گا۔ اسی پہلے رسالہ میں بہت سے اچھے مضامین اور نظمیں ہیں اور سب سے پہلا مضمون مولوی محمد عزیز مرزا صاحب آئری سکرپٹری آل انڈیا مسلم لیگ کا ہے۔ جو مسلم پائلٹس پر ہے۔ یہ مضمون الگ بھی شائع ہو چکا ہے۔ مگر مولوی ظفر علی خان صاحب نے اچھا کیا کہ اسے دوبارہ شائع کیا اور اسی سے پنجاب ریویو کے لٹریچر کا افتتاح کیا۔ ضرورت ہے کہ اس مضمون کی اشاعت بہت کثرت سے کی جائے۔ تاکہ ہندوستان کے تمام مسلمان اس سے واقف ہوں۔ اور سمجھ جائیں کہ اس پوڈینٹکل بالکل اچھے زمانے میں انھیں کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔ پنجاب ریویو کا سالانہ چنودھ مضمون ڈاک قسم خاص کے لیے ہے۔ اور قسم عام کے لیے ہے۔ درخواستیں مولوی ظفر علی خان صاحب جی۔ اے ایڈیٹر پنجاب ریویو کی خدمت میں کرم آباد۔ پنجاب کے پتہ پر بھیجی جائیں۔

چند مختصر خیالات

مسلک مذہب کی حالت مرض خطر میں ہے۔ خدا ہر آفت سے بچائے۔ نوع پرانی جو کالج

میں تعلیم پانے نکلی ہے پڑانے پور حوں کا ادب دکھانے کے لیے تو بہت کرتی ہے مگر اندر ہی اندر خود سرین دکھاتی اور نواب و قدار الملک کے ایسے کسے خیال مگر ٹری کی گرفت سے باہر ہوئی جاتی ہے۔

کس نیا موقت علم تیر از من کہ مرا عاقبت نشاء نہ کرو
مگر ہم آنا کہ دیتے ہیں کہ اس نازک حالت میں اگر نواب و قدار الملک علیحدہ ہو گئے تو پھر کالج کی خیریت نہیں۔ اگر قدار الملک بالذات بھی ہٹنا چاہتے ہوں تو انھیں کم از کم دو سال کے لیے اور ٹھہرنا چاہیے تاکہ کالج اس فتنہ سے متاثر نہ ہو۔

مسلمان مشائخ اور پیرزادوں کی اگلی تاریخ ہند دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگان دین اگلے زمانہ تین نکلتی فوج داون کی طرح مسلمانوں کو باندی شرع کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ اور مشنریوں کی طرح غیر قومین تبلیغ دین کیا کرتے تھے۔ درحقیقت یہ حضرات سچے مشنری تھے یہی لوگ بجائے سالانہ چندہ تحصیل کرنے کے اگر آج تبلیغ دین کا ایک صبح اور خاموش انتظام جاری کر دین تو مسلمانوں کو کسی بات کی شکایت نہ باقی رہے۔ آج بھی یہ حضرات اگلے زمانہ کی طرح کسی کفرستان میں ٹھہر کے اقطاب داوتا۔ اور ضروری مقامات کا دورہ کر کے ابدال بن سکتے ہیں۔ بجائے ندوۃ العلماء کے نظام المشائخ اس دینی خدمت کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ لہذا ہم خواجہ حسن نظامی صاحب کو اس جانب توجہ دلاتے ہیں۔

مسلم لیگ کو جب سے مولوی محمد عزیز مرزا صاحب سکرٹری مقرر ہوئے ہیں نمایاں ترقی ہو رہی ہے۔ اُن کے دور وں اور مسلسل سفرون نے ہر جگہ مسلمانوں میں تحریک پیدا کر دی ہے۔ فی الحال مولوی صاحب شملہ گئے ہوئے ہیں۔ اور واپسی کے وقت پنجاب کے بعض شہروں میں ٹھہرتے ہوئے آئیں گے۔ بہتر ہو کہ جن مقامات میں مولوی صاحب کا دو ایک روز کے لیے قیام ہو وہاں مسلمانوں کے حقوق اور اُن کی پالیسی کے متعلق فصیح و بلیغ اور پُر زور و پُر جوش لکچر ضرور دیں۔

مگر مولوی عزیز مرزا صاحب کو اپنی تعلیموں میں دو باتوں کا خیال ضرور رکھنا چاہیے۔ ایک تو یہ کہ پائلٹس میں بعض مسلمان گورنمنٹ کی ہی خواہی کے درجہ سے اگر کر ذلیل خوشامدی بنے جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی اصلاح کی جائے۔ اور دوسرے یہ کہ مذہبی رد و قدح اور باہمی سب دشمن اور طعن و تشنیع کا جوش و زور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ گوکہ اس آخری جوش کا رد و کٹا کسی کے امکان میں نہیں تاہم کوشش ضرور کرنی چاہیے۔

آج کل یادگار میں قائم کرنے اور اپنے جوش مسرت کو کسی مفید اور دیر بار کست کے عنوان سے ظاہر کرنے کا رواج تہنی کوتا جاتے ہے اس وقت تک ایسے واقع پرہم نے مختلف قسم کی کارروایاں دیکھیں مگر ننگور میں مولوی محمد عزیز مرزا صاحب کے تشریف لے جانے کی خوشی کا اظہار وہاں ایک فیاض درویش خیال ریسرچر جناب عبدالحفیظ صاحب نے اس عنوان سے کیا کہ اُن کے مود کی یادگار میں مدرسہ کی عمارت کو برقی روشنی سے منور کر دیا۔ یہ نئی اور اچھی ایجاد ہے۔ کیونکہ علم کا پریریشن روشنی سے بہتر اور کسی طریقہ سے نہیں ہو سکتا۔

ہم نے اگست کے دنگل میں تبلیغ دین کرنے والوں کو اس جانب آمادہ کیا تھا کہ ”عصیت جاہلیت کو توڑیں۔ نو مسلموں کو اسی طرح اپنی برادری میں لین جس طرح صحابہ کرام لیا کرتے تھے پھر اس کے بعد دیگر مذاہب کے لوگوں کو اپنے دین کی طرف بلائیں“ اور کسی نے تو اس طرف توجہ نہیں کی۔ بلکہ بعض مدعیان شرافت کو ایسی تحریک ناگوار گزری۔ کیونکہ اُن کی شرافت میں بٹہ لگا جاتا تھا مگر مولوی محمد یوسف صاحب ایڈیٹر ”نور“ قادیان نے اس تحریک کی حقیقت و اہمیت کو محسوس فرمایا۔ اور اپنے ایک پریوٹ خط میں ہمیں تحریر فرماتے ہیں کہ ”در حقیقت ہمارے مسلمان بھائی نو مسلموں کو اُن کے ترین حیوانوں سے بھی بدتر خیال کرتے ہیں۔ رشتہ ناٹھ درکنار اکثر مسلمان سیدھے منٹھ سے اُن کے ساتھ بات چیت کرنا بھی کسر نشان اور شک ہینڈ کرتے ہوئے بھی تنگ صورت خیال کرتے ہیں۔ میں آپ کا دل سے شاکر ہوں کہ آپ نے اس بند دروازے کو تھوڑی سی ٹھیس لگائی ہے۔ مگر اس کے

لیے ایک زبردست دھکے کی ضرورت ہے، ہمارے قابل دوست اس بارے میں ایک تبسوط آرٹیکل لکھنے کا بھی وعدہ فرماتے ہیں ہم ان کی اس توجہ کے شکرگزار ہیں۔ خدا تہام اسلامی انجمنوں کو اس جانب متوجہ ہونے کی توفیق دے۔ سچ یہ ہے کہ جب تک مسلمان اُس دینی اخوت کو زندہ نہ کریں گے جو تیرہ سو برس ہوئے ارض حجاز میں قائم کی گئی تھی نہ سچے مسلمان بن سکتے، مین اور نہ دین اسلام کو ترقی ہو سکتی ہے۔

اس بارے میں کچھ لکھنے پڑھنے سے زیادہ بہتر یہ عملی طریقہ ہو گا کہ ہندوستان کے مختلف بلاد میں دو چار ایسی انجمنیں یا جماعتیں قائم ہوں جو ذات اور قوم کے تعصب کو کلیتہً چھوڑ دیں ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو اپنی طرف مدعو کریں۔ جو جو لوگ شریک ہوتے جائیں ان کے مبارک ناموں کی فہرستیں شائع کرتی ہیں اور ان کی تحریک و ہدایت سے ذات باہر اور خاصۃً نو مسلم لوگوں کے ساتھ جو نایاب ہوں ان کی بھی اشاعت کر دیا کریں۔ ہمارے خیال میں اس مصیبت کے دور کرنے کا اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں ہے۔

ہمارے جدید مطبوعات

ہماری دونوں کتابیں تیار ہوئی ہیں۔ ایک تو ”انسانہ قیس“ اور دوسری ”سکینہ بنت حریث“ افسانہ قیس۔ ایک معمولی مضمون تھا جس میں دراصل بہت ہی کم واقعات تھے۔ مگر بعض مطالعہ سے اسے علیحدہ چھپوا کے فروخت کر رہے تھے۔ اب ہم نے کتب سیرۃ النبیؐ کے درجہ کے قیس مجنون کے حالات نہایت تکمیل کے ساتھ از نو مرتب کر دیے ہیں جو بالکل نئی کتاب ہے۔ اور مطبع دُلگد از نو اسے لاہور کی ایڈیشن کی کتابوں کے نمونہ کی طور پر چھاپا ہو۔ یعنی اسی دیکھ کر بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جن کتابوں کے لاہور کی ایڈیشن شائع ہوئے ان کا کاغذ اور ان کی لکھائی چھپائی کیسی اور کس شان کی ہوگی۔ پہلے یہ رسالہ ایک جُرمی بھی کہ تھا اور اب ٹائٹل کے علاوہ تین جُرمی معربا چھپا ہے۔ اور قیمت وہی رکھی گئی ہے جو معمولی افسانہ قیس کی ہے یعنی ہر قیمت رسالہ کی حیثیت سے بہت ہی کم ہے۔ مگر چونکہ ہم وعدہ کر چکے ہیں کہ لاہور کی ایڈیشن کی کتابیں اُسی قیمت پر فروخت کی جائیں گی جو پہلے سے مقرر ہے لہذا ہم کو قیمت میں زیادتی

کرنے کی جرات نہیں ہوئی۔ ہم اس رسالہ کو ان تمام حضرات کی خدمت میں دی۔ پی بھیج دی۔ جنہوں نے ہمیں عام اجازت دی رکھی ہے۔ مگر اس کی قیمت اس قدر کم ہے کہ ہم صرف اطلاع دے دینا کافی سمجھتے ہیں۔ جن حضرات کو شوق ہو طلب فرمالیں۔ بلا تیرہ سی ایڈیشن کی آئندہ کتابیں البتہ حسب قاعدہ ایک ہفتہ پہلے اطلاع دے کے دی۔ پی روانہ ہوا کریں گی۔

سکینہ بنت حسین - یہ لائف کبھی دُلگداز کے اوراق پر کئی نمبروں میں شایع ہوئی تھی۔ اب وہ پرچہ باقی نہیں رہے۔ اور اس لائف کی طلب میں اکثر حضرات کو خطوط آیا کرتے ہیں۔ مختلف احباب کا بھی تقاضا کہ اسے ایک رسالہ کی صورت میں شایع کر دیا جائے۔ لہذا دفتر دُلگداز نے اسے بھی چھاپ کے تیار کر دیا۔ یہ رسالہ علاوہ ٹائٹل کے ۸۴ صفحوں پر ختم ہوا ہے اور قیمت ۶/-

مزید دُلگداز

ہمیں آپ کی توجہ سے کسی بات کی شکایت نہیں بلکہ نہایت شکر گزار ہیں کہ آپ کی عنایت دُلگداز کی اشاعت فی الجملہ ترقی کر رہی ہے۔ اور اظہار شکر گزاری کے لیے ہم بھی دُلگداز کا حجم بڑھا دیا۔ آپ ملاحظہ فرماتے ہوں گے کہ دو مہینہ سے دُلگداز بجائے ۱۶ صفحوں کے ۲۴ صفحوں پر نکل رہا ہے۔ ہم اتنے حجم کے بھی پابند نہیں۔ اگر آپ نے توجہ فرمائی تو اس کے اوراق میں اور بھی اضافہ ہوگا۔ عزت ہے کہ ہمارے سربراہانِ مہربانی ابھی اور کوشش فرمائیں۔ امد قریب قریب اتنی ہی خریدار اور پیدا کر دین جتنے کہ اب ہیں۔ فی الحال اس کی اشاعت ۱۲۰۰ ہے۔ جب دو ہزار سے تعداد بڑھے گی تو ہم پرچہ کو اور زیادہ ترقی دین گے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ ہماری اس درخواست پر ایسی ہی توجہ فرمائیں گے جیسی غائبانہ آپ نے ہمیں عادی بنا دیا ہے۔

جو نیا ناول مفت خریداران دُلگداز کی نذر کیا جائے گا وہ ختم سال پر تیار ہو جائے

گا۔ اور ماہ جنوری میں ۱۹۱۲ء کی قیمت یعنی ہر پرچہ پر تمام خریداران دُلگداز کی خدمت میں دتی۔ پی روانہ کر دیا جائے گا۔ خریداران دُلگداز اگر اس ناول کے ملاحظہ کا شوق رکھتے ہیں اور ہمارے اس حقیر ہدیہ کو قبول فرماتے ہیں تو ہمیں فوراً اجازت دین کہ وہ نیا ناول ان کی خدمت میں دتی۔ پی روانہ کر دیا جائے۔



استیر - اسرائیلیہ

نخت نقرشاہ بابل جب پوری قوم بنی اسرائیل کو گرفتار کر کے ارض بابل میں لے گیا۔ اور فرعون مصر کے جو دستہ سے نجات پانے کے بعد خدا کی اُس منتخب قوم کو دوبارہ اسیری و غلامی کی مصیبت میں مبتلا ہونا پڑا تو وہاں انہیں انقلابات سلطنت اور مختلف تاجداروں کے اختلاف مذاق سے عجیب عجیب اوقات پیش آئے۔ اہل بابل کے مغلوب اور ایرانیوں کے ماتھے سے تباہ ہونے کے بعد بھی اگرچہ ایک مدت تک یہود کو آزادی نہیں نصیب ہوئی۔ مگر اُن دنوں اُس اسیری میں کبھی کبھی اُن کا ستارہ اقبال چمک بھی جایا کرتا تھا۔ انہیں خوش اقبالی کے واقعات میں سے ایک حسین و پریش اسرائیلیہ لڑکی استیر کا واقعہ ہے جو سچ یہ ہے کہ اپنے حسن و جمال اور اپنی دل فریب پیاری صورت کی بدولت خود ہی اپنی قوم کا ستارہ اقبال بن گئی تھی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے دل فریب چہرے میں جیسی نزاکت و نازنینی تھی ویسی اُس کے دل میں نہ تھی۔ کیونکہ اُس نے اپنے حسن کی کشتہ سازیوں سے فقط اپنی قوم کے بچانے ہی پر اتنا تسنن کی بلکہ ہزار خلعت کو قومی بغض کے جوش میں تہل کر دیا۔

اُس کی داستان جو کتاب مقدس تورہ (عہد نامہ قدیم) میں درج ہے یہ ہے کہ جب شہنشاہ اشوری شس (جو تاجداران فارس میں سے تھا) ہر تیرا س سلطنت ہوا اور اُس کا حکم حدود ہند سے لے کے سواحل بحرہ دوم تک جاری ہو گیا تو اپنی تخت نشینی کے تیسرے سال اُس نے ایک بڑا بھاری جشن منایا اور تمام اہم و مغزین کو دروڑ و ورسے بلا کے خاص اپنے دار سلطنت شوش میں بٹھرایا۔ ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی دعوت کی۔ اس جشن کے لیے بڑے بڑے سامان کیے گئے۔ عجایب باغوں اور چمنوں میں پرتکلف فرش اور زعفرانہ و طلائی تخت بچھائے گئے۔ حریر و دھس کے پردے لٹکائے گئے۔ اور سونے چاندی کے برتنوں میں تمام شاہی مہمانوں کو کھانا کھلایا گیا۔ شراب پلائی گئی۔ شراب کی یہ کثرت تھی کہ گویا نئے ارغوانی کی سیلیں لگا دی گئیں۔ شاہنشاہ

مردمانوں کی اور محل میں اُس کی مشہور ملکہ اٹھ و شے ملکہ نے عورتوں کی کھان لوانزی کی۔ اور انہیں انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔

جشن شروع ہونے کے ساتویں دن اختیاریش نے جبکہ نشہ شراب سے مخمور تھا اور جوش سرور و رون تھا خواجہ سراؤں کو بلا کے حکم دیا کہ دوشی ملکہ سے کہو کہ بڑے تکلف لباس پہن کے اور تاج شاہی سر پر رکھ کے یہاں مردوں نے بارہا میں آئے اور میرے برابر جلوہ افروز ہو گئے میری رعایا کو اپنا جمال جہان آرا دکھائے خواجہ سراؤں نے بادشاہ کا حکم ملکہ کو پہنچایا تو اُس نے اس مجمع عام میں آئے سے انکار کیا جس پر بادشاہ اختیاریش نہایت برا فرختہ ہوا اور اپنے شیشیوں اور ساتوں مغرور و بیرون سے جو فادرس کے نہیں تھے مشورہ طلب کیا کہ اس نامزدان ملکہ کے باسے میں کیا کیا جائے؟ وزیر عظیم موکان نے زمین بوس ہو کر عرض کیا کہ ملکہ نے فقط حضور کی نافرمانی نہیں کی بلکہ ایک جڑا جھاری قومی گناہ کیا ہے۔ اُس کی نافرمانی کی خبر گھر گھر مشہور ہوگی۔ اور تمام عورتیں یہ دیکھ گے کہ بادشاہ کی ملکہ ان کا کتنا نہیں مانتی اپنے شوہروں کی نافرمانی کرنے لگیں گی۔ اور سارے شوہر اپنی جو روت کی نظر میں حقیر ہو جائیں گے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ اس رتبہ سے کہ بادشاہ کی محبوبہ خاص ہیں محروم کر دی جائیں۔ اور یہ مرتبہ اعلیٰ کسی اور ایسی خاتون کو دیا جائے جو حضور کی فرمان برداری کرے۔ اور پھر اُسے دیکھ گے ساری مملکت کی عورتیں اپنے شوہروں کی اطاعت گزار بنیں۔ یہ بات بادشاہ پسند کی۔ اسی پر عمل ہوا۔ اور شے ملکہ بادشاہ کی محبوبہ خاص ہونے کو درجہ سے محروم کر دی گئی۔

اب بادشاہ کے لیے کسی نئی حسینہ کی تلاش شروع ہوئی۔ بادشاہی غلاموں کی بکریک پر ساری قلعہ میں حکم جاری ہو گیا کہ ہر جگہ حسین اور گنوار می لڑکیاں جمع کی جائیں۔ اور ان میں سے جو جادو نگاہ عورتیں منتخب ہوں وہ لاکے ایوان شہر یاری میں شاہی خواجہ سراؤں کے زیر نگرانی رکھی جائیں تاکہ وہ انہیں بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کرنے کے قابل بنائے۔ بادشاہ کی خلوت میں پیش ہونے کے لیے ضرور تھا کہ ہر حسینہ ایک سال تک خواجہ سراؤں کے زیرِ تیمام رہے جسے چھ مہینہ تک فرار اور لوہان اور عود وغیرہ کی دھونی دی جاتی اور چھ مہینہ تک اُس کے ہنڈے میں عود اور اگر اور دوسری خوشبودار چیزوں کے تیل بٹھے اور غوطے جاتے۔ الغرض سارے ملک سے آٹھ جادو نگاہ اور سو قانت دلربائیں چن کر بادشاہ کے لیے رکھی گئیں۔

انہیں میں ایک استیر بھی تھی جس کی اصلیت یہ تھی کہ ارض مقدس سے جو یہودی گرفتار ہو کے بابل میں آئے تھے اُن میں "مرد خاے" نام ایک اسرائیلی تھا جو نبیا میں کی نسل سے تھا استیر اُس کے چچا کی بیٹی تھی جو اپنے ماں باپ کے مرجانے سے مرد خاے کی توکیت میں تھی اور مرد خاے نے بیٹی بنا کے اُسے ناز و نعم سے پالا تھا حسن و جمال میں دُور دور تک اُس کا جواب نہ تھا۔ اور یہ حالت تھی کہ جس کی طرف نظر اٹھا

دیکھ لیتی اُس کا شیدا اور گرویدہ ہو جاتا۔ مرد خائے نے خود ہی استیر کو خواہ مرادوں کے پاس بھیجا۔ مگر تاکید کر دی کہ جزا کسی کو نہ بتانا کہ مین اسرائیلیہ ہوں۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ منتخب کر کے رکھ نہ لی جاتی۔ خواہ مرادوں نے اسے پسند کر کے رکھ لیا اور اُس کی تدفین دتدین ہونے لگی۔

برس گزرنے کے بعد اُن اٹھوں لڑکیوں میں سے ہر ایک بادشاہ کی غفلت میں بھی گئی۔ اور صبح کو نہ پسند ہو سکے کل گئی استیر کی باری آئی تو بادشاہ اختویرش دیکھتے ہی فریقتہ ہو گیا۔ اور اُس کو بادشاہ کی محبوبہ بنام اور ملکہ آفاق بننے کی غرض دی گئی۔ اس طریقے سے اختویرش کی تخت نشینی کے ساتویں برس استیر اُس کی ملکہ بنی۔ ایسی پریمی جمال اور جوش و خروش نازنین کے ملنے پر بادشاہ نے بڑی خوشیاں کیں۔ جشن منائے۔ لوگوں کو انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔ استیر نے اب تک کسی کو اپنا اسرائیلیہ ہونا نہیں بتایا تھا۔ مگر ہر مین اپنے عربی مرد خائے کی مطیع و مقادمتھی۔ اور مرد خائے کو بھی اُس سے اس قدر محبت تھی کہ اب اُس نے بھی بادشاہ کی ڈیوڑھی ہی پر ہنسا شروع کر دیا۔

اتفاقاً مرد خائے کو شاہی ڈیوڑھی پر پڑے پڑے یہ حال معلوم ہوا کہ بادشاہ کے دو غلام اُس کی جان بچا کر حملہ کرنے کی تاک میں ہیں اس کا حال اُس نے استیر کو بتا دیا۔ اور استیر نے جا کے بادشاہ سے عرض کر دیا۔ تحقیقات کی گئی تو ثابت ہو گیا کہ وہ دونوں غلام واقعی ایسی نمک حرامی کی تجویز میں تھے اس جرم کی سزا میں اُن دونوں کو سولی دی گئی۔ اور بادشاہ نے حکم دیا کہ یہ واقعہ پورا پورا اُس کے روزنامے میں درج کر دیا جائے۔

اس اثنا مین بادشاہ وزیر اعلیٰ سے اپنے ایک وزیر جس کا نام ہامان تھا سبت مہربان ہوا۔ اس کا قرب روز بروز بڑھتا گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اُس کی عزت و وقعت بھی بڑھانی لگی۔ یہاں تک کہ عام حکم دے دیا گیا کہ جب وہ قصر شاہی مین آیا کرے تو تمام غلامان شاہی سامنا ہوتے ہی اُس کے سامنے سجدے مین گر پڑا کریں۔ سب غلاموں نے اس حکم کی تعمیل کی مگر مرد خائے جو ہمیشہ آتے جاتے وقت ہامان کو بادشاہ کی ڈیوڑھی پر بٹھایا نظر آیا کرتا تھا کبھی سجدہ نہ کیا بعض غلاموں نے کہا بھی کہ تم سجدہ کیونکر نہیں کرتے؟ اُس نے جواب دیا کہ یہ تو مجھ سے نہ ہو گا کہ ایک مخلوق کے آگے سجدہ کروں۔ غلاموں کا جب مرد خائے پر کوئی زور نہ چلا تو ہامان سے جا کے لگا دی کہ یہ شخص آپ کے آگے سجدہ کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بتا دیا کہ یہ یہودی ہے۔ ہامان یہ سن کے نہایت برا فروختہ ہوا اور ارادہ کیا کہ اُس سے انتقام لے۔ مگر دل مین کہا کہ اکیلے اس ایک شخص سے بدلہ لیا بھی تو کیا مین اس کی ساری قوم سے بدلہ لوں گا۔ اور اس فکر مین لگا کہ اختویرش کی مملکت مین جتنے اسرائیلی مین اُن سب کو قتل کر ڈالے۔

اخترش کی تخت نشینی کے بارہویں سال ہامان نے پوری طرح تہ نگاہ کیا کہ ساری قلعہ میں کتنے یہودی اور کمان کمان آباد ہیں۔ پھر بادشاہ کی خدمت میں آ کے عرض کیا کہ حضور کے ملک میں ایک مکرش کردہ ہے جو لوگ متفرق و منتشر طور پر جا بجا آباد ہیں۔ اور سب کی یہ حالت ہے کہ احکام شاہی کی بجائے اور ی میں تامل کرتے ہیں ان کا کیشن آئین ان کا طور طریق۔ اور ان کو رسم و رواج سب جدا ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ زندہ نہ چھوٹے جائیں۔ اس لیے اگر حضور کی مرضی ہو تو ان سب لوگوں کے قتل و غارت کا حکم جاری کر دیا جائے تاکہ وہ مطلقاً فنا کر دیے جائیں۔ اور اس کے معاوضہ میں دس ہزار وزن (جو اُس زمانہ میں مروج ہوا) چاندی ان لوگوں کے ہاتھوں سے قتل و غارت کی کارروائی کریں گے خزانہ شاہی میں داخل کرادوں گا۔ بادشاہ نے وزیر کی یہ درخواست قبول کر لی۔ اپنی انگوٹھی اتار کے اُس کے ہاتھ میں دی اور کہا ”یہ میری مہر ہے۔ جو حکم تم کو مناسب معلوم ہو میری جانب سے جاری کر دو۔“

بادشاہ سے منظور ی حاصل کر کے ہامان بے انتہا خوش ہوا اور اُسی وقت تمام ممالک محروسہ اور کل اضلاع و قطاع میں عمدہ داروں۔ دالیوں۔ امیوں۔ مرزبانوں۔ (تعلقداروں) کے نام فرمان جاری ہو گیا۔ کہ فلاں تاریخ ہر جگہ جتنے اسرائیلی ہوں بلا استثنا و امتیاز مع زن و فرزند قتل کر ڈالے جائیں۔ اور ان کا گھر بار لوٹ لیا جائے۔ جو دار کوئی یہودی زندہ نہ بچنے پائے اس حکم کے جاری ہوتے ہی ہر جگہ تہلکہ مچ گیا۔ یہود کے دشمن اپنی تلواریں تیز کرنے لگے۔ اور یہودیوں میں ایک عام ماتم بپا ہو گیا۔ ہر جگہ ایک گھبراہٹ اور اضطراب کا عالم طاری تھا۔ ہاں ایک ہامان البتہ بادشاہ کی صحبت خاص میں بیٹھا شراب کے جام لٹکھارہا تھا۔

مرد خائے کو ان باتوں کی خبر ہوئی تو اُس نے مارے صدمہ کے کپڑے پھاڑ ڈالے سارے پتھرے میں خاک ملی۔ ایک کھال اوڑھ لی۔ اور وسط شہر میں کھڑے ہو کے چیخاں مار مار کے رویا۔ اور اسی وضع سے شاہی ڈیوڑھی پر آیا جہاں عام حکم تھا کہ جو شخص کھال اوڑھے ہوئے ہو چاہے کوئی ہو اندر نہ آنے پائے۔ مرد خائے کی اس حالت کی خبر خواجہ سراؤں نے استیر کو پہنچائی تو وہ نہایت ہی ملول ہوئی۔ اور کپڑے پیچھے کر کے ان کی کھال کی پوشاک بدلواؤ جس سے مرد خائے نے قطعاً انکار کیا۔ تب استیر نے اپنے رازدار خواجہ سرا ہتاخ کو بھیجا کہ پوچھو ”آخردا قو کیا ہے؟“ ہتاخ سے مرد خائے نے ساری کیفیت بیان کر دی۔ اور وہ رقم بتائی جس پر اسراہیلیوں کی جائیں اصول لی گئی تھیں۔ اور شاہی فرمان کی ایک نقل بھی بھیج دی کہ استیر خود ہی پڑھ کے معلوم کر لے

کہ اسمیریلیون کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ اس کے ساتھ کہلا بھیجا کہ تم بادشاہ کے سامنے جا کے رو دو اور اپنی قوم کو اس عام ہلاکت سے بچاؤ۔ یہ پیام سن کے استیر نے کہلا بھیجا ”بڑی خرابی تو یہ ہے کہ میں بالکل مجبور ہوں۔ میں بھی مہینہ بھر تک بادشاہ کے یہاں بٹلائی نہ جاؤں گی۔ اور وہاں عام قاعدہ یہ ہے کہ چاہے کوئی ہومرد ہو یا عورت غزنو یا دوست اگر بے بلائی بادشاہ کی خلوت خاص میں چلا جائے تو بلاتاً مل قتل کر دیا جاتا ہے۔ سو اس شخص کے جسے خود بادشاہ اپنے سونے کے عصا سے شاہی سے اشارہ کر کے اس عام قاعدے سے مستثنیٰ کر دے۔ میں بے بلا ہوں گی تو جب تک وہ مروجہ ہوں ہوں قتل ہو جاؤں گی۔“ اس جواب پر مرد خاں بہت پرہم و آشفہ ہوا۔ اور کہلا بھیجا ”نہ سمجھ کر اپنی ساری قوم کے قتل ہو جانے کے بعد تو بادشاہ کے محل میں ہونے کے باعث حین سے بیٹھ سکے گی۔ اگر تو نے اس موقع پر قوم کی سفارش کو ٹال دیا تو بنی اسرائیل تو اس عالم میں پہنچ گئے آرام پالیں گے اور سرد رو بجات کام تہ پائیں گے مگر تو اور تیرا گھرانہ ہلاکت میں پڑ جائے گا اور تیرے دل پر ہمیشہ ایک پست رہے گی۔ خدا کی مصلحتوں کو کون جان سکتا ہے؟ ممکن ہے کہ اسی دن اور اسی گھڑی کے لیے اس نے تجھے بادشاہ کے محل میں پہنچایا ہو۔“ استیر نے اس کے استیر کے دل میں قومی ہمدردی کا جوش پیدا ہوا۔ اور کہلا بھیجا ”اچھا میں قوم کے لیے جان دینے کو تیار ہوں۔ آپ شہر نشین کے سارے اسمیریلیون کو جمع کر کے حکم دیجئے کہ میری طرف سے سب روزہ رکھیں میں ان کی سفارش کے لیے بے بلا ہوں بادشاہ کے پاس جاؤں گی۔ اگر ماروا لی گئی تو مضائقہ نہیں۔ قوم کی خدمت گزار میں مردن گی۔ اور جتنی بھی خوشامد خدا میری سن لے۔“ یہ جواب پا کے مرد خاں داپس گیا۔ اور کل یہودیوں کو روزہ اور دعا و استغفار کی ہدایت کر دی۔

جب استیر اور اس کے ساتھ ساری قوم نے تین دن تک روزہ رکھ لیے تو تیسرے دن استیر نے شاہی لباس اور زیور سے آراستہ ہو کے اور اپنے آپ کو خوب بنا چنا کے بادشاہ کی اندرونی محل میں قدم رکھا۔ اور اس کمرے کے سامنے جا کھڑی ہوئی جس میں بادشاہ اپنے تخت سلطنت پر جلوہ افروز تھا۔ اور جہاں سے بادشاہ کا سامنا ہوتا تھا۔ لوگ اس کے قتل کے لیے جھٹٹے ہی کو تھے کہ بادشاہ کی نظر پڑ گئی۔ اور جوش محبت سے تیار ہو کے فوراً اپنی سونے کی چھتری اس کی طرف اٹھادی استیر نے دوڑ کے اس چھتری کی نوک کو ادب سے چوم لیا۔ اور مودب کھڑی ہو گئی۔ بادشاہ نے نہایت ہی محبت کے لہجے میں کہا ”ملکہ استیر کیا چاہتی ہو؟ بتاؤ۔ مانگو گی تو اُدھی سلطنت تک دینے کو تیار ہوں۔“ استیر نے عرض کیا کہ ”اور میں بس اتنا چاہتی ہوں کہ بادشاہ اور وزیر ہاں آج میری دعوت

قبول فرمایا۔ بادشاہ نے فوراً دعوت قبول کی۔ اور اسی وقت ہامان کو بلوایا کے ملک کی دعوت میں چلا آیا۔ ہامان جب شراب کے دو ایک جام پیے۔ اور مرور ہوا تو جام شراب کو نمہ سے لگا کے کہا "ملا ستیر تھا کیا سوال ہے؟" بتاؤ کہ پورا کوئی آدمی غفلت تک مانگو گی تو نے دن کا۔" استیر نے عرض کیا میری تناسیب یہ ہے کہ کل بھر نہیں حضور اور وزیر ہامان میری دعوت میں شریک ہوں۔ بادشاہ نے یہ درخواست بھی قبول کی۔ اور استیر دوسرے دن کی دعوت کے لیے بڑے بڑے سامان کرنے لگی۔

ہامان خوش خوش بیان سے محل کے چلا تھا کہ ڈیوٹھی پر مردخا سے کی صورت نظر آئی جس نے اسے سلام کیا۔ اس کے سامنے یہ کیا۔ یہ دیکھ کے اس کے دل میں ایک کانٹا سا لگا جو کہ تک ٹھٹھا لگا۔ گھر پہنچے ہی اس نے اپنی جو ریش اور اپنے یاران صحبت سے کہا "خدا نے مجھے بہت کچھ دولت و عزت دی ہے۔ اولاد کی طرف سے بھی خوش نصیب ہوں۔ تیر و منزلت کی یہ حالت ہے کہ بادشاہ نے مجھے ملک کے تمام امرا سے زیادہ معزز بنا دیا۔ بیان تک کہ دیکھو علی مرتبہ ملا استیر کی دعوت میں بادشاہ کے ساتھ شریک ہونے کی عزت ساری مملکت میں میرے سوا اور کسی کو نہیں نصیب ہوئی اور کل پھر ملکہ نے کمال لطافت و کرم سے مجھے اور بادشاہ کو اپنے یہاں بلوایا ہے۔ مگر یہ باتیں اور ساری عزتیں خاک میں مل جاتی ہیں جب لکھتا ہوں کہ شاہی مجلس کی ڈیوٹھی پر مردخا نے بونوی زور و خجوت سے بٹھا ہوا ہے۔ جو نہ میرے سامنے سجدہ کرتا ہے اور نہ مجھے سلام کرتا ہے۔" میان کی زبان سے یہ باتیں سن کے زرش بولی "تو تم ایک کام کرو۔ آج ہی ایک چپاس ہاتھ کی لمبی دھتی بنوا رکھو اور کل جاتے ہی بادشاہ کی خدمت میں عرض کرنا کہ یہ یہودی ایسا گستاخ اور بے ادب ہے۔ اور حضور سے منظوری لے کے اسے کل ہی اس دھتی پر سولی دلوانا۔ اور جب اسے سولی دے چکنا تب خوش خوش جا کے ملاقات کی دعوت میں شریک ہونا۔" ہامان نے یہ تجویز پسند کی اور اس دھتی کو تیار کر کے لوگوں کو ہدایت کر دی کہ میرے جانے کے تھوڑی دیر بعد تم اسے لے کے ایوان شاہی میں آ جانا۔

اور صبح ہی رات کو بادشاہ اختویرش کے وہاں یہ واقعہ پیش آیا کہ بادشاہ کی نیند اچاٹ ہو گئی اور جب کسی بات میں دل نہ لگا تو اپنے کاتب کو بلایا کہ حکم دیا کہ میرا توڑنا چھو تو پڑھ کے سناؤ۔ روزنامہ سننے سننے سے جب اس واقعہ پر پہنچا کہ "دونک حرام غلاموں نے بادشاہ کے قتل کی سازش کی تھی مگر مردخا کی حسن کارگزاری سے ان کا فریب کھل گیا" تو چونک کے بولا "اس شخص مردخا کے ساتھ اس حسن کارگزاری کے مقابل میں کیا سلوک کیا گیا؟" لوگوں نے عرض کیا کچھ نہیں۔ یہ بات رات بھر بادشاہ کے خیال میں رہی اور صبح کو بھی اسی فکر میں تھا کہ سامنے سے ہامان نمودار ہوا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی اختویرش بولا "ان تم خوب آئے۔" بتاؤ کہ جس شخص سے بادشاہ خوش ہو اور اس کے ساتھ احسان کرنا چاہتا ہو

اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ ہامان نے دل میں کہا کہ میرے سوا بادشاہ اور کس سے خوش ہیں اور وزیر ہامان کے سوا اور کون ہو سکتا ہے جس پر وہ احسان کرنا چاہتے ہوں لہذا جو شخص میرے ساتھ ہو رہا ہو وہ بولا "خداوند اُسے اپنا لباس خاص بچاؤ میں اپنا تاج اُس کے سر پر دینا اپنے خاص گھوڑے پر اُسے سوار کرالیں۔ پھر اس شان سے اُسے شہر میں نکالیں۔ اور کسی اپنے مخصوص امیر کو حکم دیں کہ اُس کے عہدہ کا رتبہ اور یہ منادی کرنا جائے کہ جسے حضور بادشاہ سرفراز کرنا چاہیں یوں سرفراز کر لیں۔" ہامان کی زبان سے یہ الفاظ سُن کر بادشاہ خوشی میں نہ آیا بلکہ اُس کے ہاتھ پر تاج اور گھوڑے کے ڈیوڑھی پر جاؤ۔ وہ ان مروجہ نام ایک بیوی بٹھایا ہے اُس کو لباس اور تاج بچا کے اور اُس گھوڑے پر سوار کر کے شہر میں بھراؤ۔ اور تم خود اُس کے ہمراہ رکاب رہ کے منادی کرو کہ جس کو بادشاہ سرفراز کرتا ہے یوں کرتا ہے۔" یہ حکم سنتے ہی ہامان کے دل میں ایک آگ سی لگ گئی۔ مگر کیا کر سکتا تھا؟ حکم حکم مغالبت اور اُٹا ہی حکم کی تعمیل کی۔

اس کارروائی کے بعد مروجہ توپھر جا کے بادشاہ کی ڈیوڑھی پر ٹھہر گیا۔ مگر ہامان خون کے آنسو بہاتا اور اپنے حسد کی آگ میں جلتا بھٹتا اپنی بی بی زرش کے پاس پہنچا اور ساری کیفیت بیان کی۔ اُس نے میان کو دل شکستہ دیکھ کے کہا "تو تم کڑھتے کیوں ہو؟ ایسا ہی ہے تو اب قتل ہیو د کے دن تم ہی المیہ کی خون ریزی کی ابتدا شہر شوشن میں اسی مروجہ سے کرنا۔ اور اسی دھن پر اُسے مصلوب کرنا۔ میان بی بی ہامان میں یہ باتیں بھی ہی تھیں کہ شاہی ہر کاروں نے اُس کے کہا "آپ کی یاد ہوئی ہے۔ ملکہ آفاق حسین و زہین ملکہ ستیر کی دعوت میں چلیے۔"

اس پیام سے ہامان کی گونہ اشک شوئی ہوئی۔ فوراً درباری کپڑے پہن کے گیا۔ اور بادشاہ و وزیر دونوں استیر کی مجلس اور باغ میں جا کے کھانے پینے میں مصروف ہوئے۔ بادشاہ آج بہت ہی خوش اور شادان تھا۔ اور ملکہ استیر کے حسن نے اُس کو از خود رفتہ بہار کھا تھا عجم شراب کو منہ سے لگاتے ہی بولا "ناؤ میں میرے حسین ملکہ! باتیر کیا سوال ہے؟ کہہ چکا کہ مانگے گی تو واقعی طاقت ملک دے ڈالوں گا۔" استیر نے ایک ناز آفرینی کی ہوش رُبا داد سے زمین ادب چوم کے کہا "اگر مجھ پر حضور کی نظر عنایت ہے تو میں اپنی اتجا اور بی بی متناؤ آرزو ہے کہ میری جان بخشی ہو اور میرے ساتھ میری قوم کی بھی جان بخشی دی جائے۔ کیونکہ ہم سب قتل و غارت کے لیے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ اور دو تین روز میں ہم سب قتل ہو جائیں گے۔ کاش اتنا ہی ہوتا کہ ہم لوگ بیچ کے نوڈنٹی غلام بنائے جاتے تو میں صبر کرتی۔ مگر میان تو ہماری بیوی ہی سے لوگ ہماری جان کے درپے تھیں۔" بادشاہ نے نہایت متحیر ہو کے پوچھا "کس نے مول لیا؟" اور وہ کون ہے جس کا ایسا ارادہ ہے؟

اب ہتیر من غصہ ضبط کرنے کی تائب تھی بولی یہی بخت ظالم ہامان جو یاس ٹٹھا ہوا ہے۔ اور ہم سب کے خون کا پیاسا ہے۔ ”ملکہ کی زبان سے یہ الفاظ سُن کے ہامان تو مارے خوف تھے کانپنے لگا۔ اور بادشاہ اختویریش شہر اب پتے پتے جام و صراحی کو ہاتھ سے رکھ کے مائے غصہ کو اٹھا اور سانے باغ میں جا کے ٹٹلنے لگا۔ مگر چہرے سے غیظ و غضب آثار نمایاں تھے۔

بادشاہ کے ہتھے ہی ہامان ملکہ استیر کے قدموں پر گر پڑا۔ اور غفو فقیر کے لیے گواہ گوار ہاتھ لگا بادشاہ پیش کے ساتھ ولس یا۔ اور ہامان کی طرف جملکہ استیر کے تخت کے آگے سرسجود پڑا ہوا تھا مخاطب ہو کر بولا ”اور اب جی میری ملک بھی میرے پہلو سے اٹھا کے اور بازرنجیر کر کے کھینچی جاوے گی یا نہیں؟“ اور بادشاہ کی زبان سے یہ تشن را الفاظ نکلے اور اُدھر شاہی غلاموں نے حجر سون کی طرح ہامان کا سر کڑے میں لپیٹ لیا۔ یہ کارروائی ہو ہی رہی تھی کہ وہ شخص جسے ہامان حکم سے آیا تھا وہ پچاس ناٹھ کی لمبی دھنٹی لیے ہوئے شاہی محل میں پہونچا۔ اور لوگوں نے بڑھ کر کے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ ہامان نے یہ دھنٹی اس لیے تیار کر لی تھی کہ اس پر مرنے والے کو سونے لودا سے لگا باؤنما غصہ میں بھرا ہوا تو تھا ہی حکم یا لگا دھنٹی پڑھی لیجا کے اس ظالم ہامان کو سونے دو جس کی فوراً تقسیم ہو گئی ہامان کے قتل ہو چکنے کے بعد اختویریش کا غصہ تھا۔ اور وہ پھر اپنی امرا ملکہ کے گھر میں عیش و عشرت میں مشغول ہوا۔

بادشاہ نے ہامان کا گھر اور اُس کی ساری جائیداد ملکہ استیر کو دے دی۔ استیر نے اب موقع پا کے اپنے اور مرنے والے کے تعلقات قرابت بادشاہ پر ظاہر کر دیے جن کو معلوم کر کے بادشاہ خوش ہوا۔ اور اُنہی وقت اُس کے حسبِ مطلب مرد خاے حاضر دربار ہوئے زمین بوس ہوا۔ بادشاہ نے اپنی انگوٹھی جو ہامان سے چھپین لی گئی تھی اپنی انگلی سے اُس کے مرد خاے کو عطا کی گویا اُس کو ساتھ ہی اسے خلعت وزارت عطا ہوا۔ اور ان سب تعات کے بعد مرد خاے نے جا کے ہامان کے مکان اور جائیداد پر قبضہ کیا۔

لیکن ابھی تک استیر کو اطمینان نہیں ہوا تھا۔ موقع پا کے وہ پھر ایک بار بادشاہ کے قدموں پر گری اور رورو کے عرض کیا کہ تھو مجھے اور میری قوم کو ہامان کے شر سے بچائیں۔ کیونکہ قتل و غارت یہو کا حکم ابھی تک منسوخ نہیں ہوا ہے۔“ بادشاہ نے اپنی طلائی جریب اُس کی طرف اٹھا دی۔ جو کہ امان دینے کا اٹھا تھا۔ اور استیر ہاتھ جوڑ کے اور مودب کھڑے ہوئے کہنا شروع کیا کہ ”اگر میں جھوٹ کی نظر میں جھلی اور جھوٹ کی مور و غیبت پر تو فرمان جاری ہو کہ ہامان کے جاری کیے ہوئے احکام منسوخ ہوں۔ ورنہ سارے اسرائیلی قتل ہو جائیں گے اور میں اپنی قوم کے قتل عام کو کیونکر دیکھ سکوں گی؟“ اختویریش نے اس کے جواب میں اُس کی اور مرد خاے کی طرف متوجہ ہو کر کہا ”میں نے ہامان کا گھر بار تم کو دیا۔ اُس کو مصلوب کر لیا۔ اور اپنی انگوٹھی بھی تم کو

دے دی۔ اندازم کو اختیار ہے کہ جس شمنون کا فرمان چاہو میری طرف سے اور میرے نام سے جاری کو تو مردھا
نے اجازت پاتے ہی تمام والیوں مرزبانوں - رئیسوں اور فوجی افسروں کے نام فرمان جاری کر دیا جس کی
نقلین تمام علاقوں اور ممالک محروسہ میں سناڈنی سواروں - ہر کاروں اور سالہ کے سواروں کے ذریعہ
سے بڑی عجلت کے ساتھ روانہ کی گئیں۔ اس فرمان کی رو سے پہلا قتل یہود کا حکم منسوخ کیا گیا تھا۔ اور یہود کو
حکم تھا کہ اسی تاریخ جو ان کے قتل کے لیے مقرر کی گئی تھی ہر شہر میں جمع ہوں۔ اور اپنے تمام دشمنوں اور
ان سب لوگوں کو جو ان کے خلاف ہوں مع زن و فرزند قتل دہلاک کر دیں۔ اور یہ کارروائی ہر جگہ اور ہر
گاؤں میں ایک ہی دن اور ایک ہی وقت ہو۔ یہی حکم خاص دار السلطنت شوشن میں بھی جاری ہو گیا جس کے
بازاروں میں مرد خائے آسمانی رنگ کا لباس شاہی اور اس پر لٹھی عباسی عروانی پہنے سونے کا مربع
تاج سر پر رکھے کر و فر سے برآمد ہوا۔ اور اس کی صورت دیکھ دیکھ کے یہودی ہر جانب سے نفرت
مسرت بلند کرتے تھے۔

آخر وہ قتل کی تاریخ آئی۔ اور یہود نے بلا تامل اپنے دشمنوں اور اپنے ستارے والوں کو قتل کرنا شروع
کیا۔ اس یورش میں شہر شوشن کے اندر ہامان کے دس بیٹے بھی قتل ہوئے لیکن یہود نے سوا قتل کرتے
کے لوٹنے اور تاخت و تاراج کرنے سے بالکل ہاتھ روکا۔ شام کے وقت بادشاہ خشویرش کو اس واقعہ کی اطلاع
ہوئی۔ اور اس نے استیر سے مل کے کہا "نارافرن ملکہ خاص دار السلطنت میں بائیسوا دی اسرئیلیوں کے ہاتھ
سے قتل ہوئے۔ اور اضلاع میں جو کچھ ہوا ہو گا وہ اس کے علاوہ ہے۔ اس لیے اے میری پیاری سلطنت
کہ اب تیر کیا سوال ہے؟ جو کہے گی کروں گا۔ اور جو مانے گی دوں گا۔" استیر بولی میں چاہتی ہوں کہ ایسے ہی
قتل عام کی اجازت شہر شوشن میں یونیوں کو کل بھر دی جائے۔ اور ہامان کے لڑکوں کی لاشیں مصلوب کی جائیں
بادشاہ نے کہا منظور اجازت ہی کہ اسرئیلی بھر اپنے دشمنوں کو قتل کریں۔ چنانچہ دوسرے دن بھی قتل عام
شروع ہوا اور شوشن میں اس دن یہود نے۔ ہزار آدمی قتل کیے۔ مگر دیگر مقامات اور اضلاع میں نقطہ پہلے ہی
دن خونریزی ہوئی تھی جس میں ۵۰ ہزار آدمیوں کو یہودیوں نے قتل کیا۔

الغرض اضلاع میں دوسرے دن اسرئیلیوں نے اپنے دشمنوں کو قتل کر کے خوشیاں کیں اور عید
منائی۔ اور شہر شوشن میں دو دن قتل کرنے کے بعد تیسرے دن۔ اور سی کی یادگار میں مرد خائے کے اشارے سے یونیوں
میں دلچسپا گیا کہ ہر سال دو دنوں میں بڑی بھاری عید منائی جاتی۔ ساری قوم کے نوجوان مرد اور بوڑھے بچے
اچھے اور نئے کپڑے پہنتے فیاضیان کرتے۔ باہر عورتیں کرتے۔ اور اپنی اس قومی کامرانی کی یاد ہمیشہ تازہ رکھتے۔
یہ بھی ایک یہودیہ سینہ کے حسن کی ہولناک کرشمہ سازی جو ظاہر کرتی ہے کہ ملتوں کی امیری و مظلومی

ہو دکی ہوسین اور از نوین اور ان کی خوشیاں کس درجہ ذلیل کر دی تھیں اور جوش انتقام نے انھیں کیسا
ناخدا ترس بنادیا تھا۔

۱۹۱۰ء سے رخصتی ملاقات

او میلان جانے والے اجاؤ اخدا حافظ اچھے آئے اور اچھے جلتے ہو جس طرح عیسائیوں میں خاد کرکس
نے نئے طرح کے کھلونے لایا کرتے ہیں تم ہمارے لیے نئی نئی اور نئے نئے کئی مٹائیں لائے تھے۔ اور اب
تم جاتے ہو تو اس وقت بھی ہمارے سینہ آرزوین اور امیدوں سے مالا مال ہیں۔ مگر جس زلی دربار میں جاتے
ہو وہ ان اتنی سفارش بھی کر دیا کہ یہ آرزوین جو تم ہمارے دلوں میں پیدا کر کے چلے ہو دل کی دل ہی میں نہ
رہیں بلکہ پوری بھی ہوں۔

تم نے اپنے عہد کے درباری حصہ میں ایک بڑا قیامت بکھڑکا پیدا کر دیا۔ ایک ایسا غلام انسان مدار
ستارہ اس عظمت و جبروت اور ایسے نور و شورش سے ہماری طرف بڑھتا تھا آتا تھا کہ ہمیں اتنی کیساری
دنیا کی خیریت نہیں نظر آتی تھی۔ اہل بیات نے یہ کہہ کے دھلادیا کہ اہل تو یہ ایک ایسی زبردست عکودے گا
کہ وعدہ قرآنی کے مطابق دنیا کا یہ سارا کارخانہ نسیا فسیا اور یہ بڑے بڑے سربراہ فلک پہاڑ کا لہجہ
دھچکی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح منتشر اور پریشان ہو جائیں گے۔ اور بالفرض اس کی زو سے
بچ بھی گئے تو اس کی آتشیں دم کے اثر سے بجا دشوار ہے جس میں تمام اہل عالم جل جہن کے خاک
ہو جائیں گے۔ مگر خدا نے بڑی خیریت کی۔ کچے اوبال بال بچے۔ تاہم یہ اس کا اثر ہوا نہ ہو تم نے
خود برباد کر دی کہ ہمارے ہر دل عزیز اور صلح جو تاجدار لنگ ایڈورڈ فٹم کو ہمیشہ کے لیے ہم سے چھین لیا۔
جو ایک ایسا سانحہ تھا کہ قیامت تک تمہارے نام کو ایک نجوست کے عنوان سے آشکارا کرتا رہے گا۔
اس لیے تم اگر ایک داغ دے کے جاتے ہو تو ایک داغ لے کے بھی جاتے ہو۔

مگر باوجود ان سب باتوں کے تم جس وقت چلے ہو دنیا کو اچھی چل پہل اور روئی پر چھوڑ کے چلے ہو۔
شاہ اٹھارہ کے بعد تم نے ہمارے سر پر شہر باری پر ایک جوان محبت و جوان بخت تاجدار کو جلوہ فرما
کر کے ہمیں ایک اچھا دم دل اور عدالت گستر شہر باری نہیں دیا بلکہ چلتے چلاتے ہمارے لیے ایک نئے
نازل سلطنت لارڈ ہارڈنگ کو بھی لائے ہو جو امید ہے کہ ہمارے حق میں نعم البدل ہوں گے
اور جن کی ذات سے ہماری ساری قومی اور ملکی امیدیں وابستہ ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ
کے تم نے اپنے خاتمہ پر ہمیں یہ مردہ سنا دیا کہ خوری ملک میں تاجپوشی کے موقع پر

موقع پر خود دولت حضور ملک منظم گنگ اپسر ر شاہ جارج پیچم رونق افروز ہندوئوں کے جو ہندوستان کی برٹش عہد کی تاریخ میں بالکل نیا اور ہندوستانیوں کے حوصلہ سے زیادہ مسرت و شاد کا می کا دافعہ ہے۔ ہندوستان ایک خالص مشرقی ملک اور بادشاہ پرستوں کی بستی ہے۔ یہاں وائے بادشاہ کے نام سے جیتے اور بادشاہ کے جمال جہان نارا کی زیارت کو عبادت تصور کرتے ہیں۔ یہاں کے بت پر اپنے بادشاہ کو دیوتا اور تار یا مظہر اندوئی اور یہاں کے موحد اُسے سائیہ اُپھی تصور کرتے ہیں ایسے لوگوں کے حق میں اپنے بادشاہ کے قدموں سے دُور دور اپنے تاجدار کی حضور می سے محروم رہنا دراصل ایک قسم کا ظلم ہے جس کو اہل مغرب محسوس بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن بحمد اللہ کہ اس تناضل کے جو رک خود حضور شاہ جارج پیچم نے پوری طرح محسوس فرمایا۔ اور ہمارے اس درد دل کے علاج کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اور ہندوستان جو شہ دل اور خلوص عقیدت سے کہہ رہا ہے کہ "بابا واکرم کن کہ خانہ خانہ تست" ہندوستان کی آرزو تو یہ ہے کہ حضور شاہ جارج پیچم وہ کے ہم پر حکومت کریں اور ملاحظہ فرمائیں کہ ہماری اطاعت کیشی و فرمان برداری بڑھی ہوئی ہے پائبل مغرب کی۔ اور بادشاہ پرستی میں کون سے جو ہر اہل مقابلہ کر سکے۔ تاہم جن لوگوں کی ایسی آرزو میں اور کشائیں ہوں۔ اور جن کی آنکھیں مدتوں سے اپنے بادشاہ اور تاجدار کی صورت زیادہ دیکھنے کو ترس گئی ہوں انھیں یہ خوش خبری سُن کے کہ ہمارے بادشاہ فلک پانگلاہ خاک ہند کو عزت اور ہمارے قدم تاریخی دار سلطنت شہر ملی کو رونق بخشنے والے میں جیسی اور جس قدر خوشی نہ ہو کم ہے۔ یہ اُس قسم کی خوشی ہے جس سے اہل ہند اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے محروم سمجھ چکے تھے۔ اور مایوس ہونے کے بعد جو آرزو پوری ہو اُس کی قدر جاننے والے بھی میرے خیال میں زیادہ تر شعراے مشرق ہی ہیں۔ بہر حال خدا رحمت کرے تجھ پر ایسے ۱۹۱۰ء کے تو نے چلتے چلتے ایک ایسا فردہ سُنا دیا کہ ۴۔ برین فردہ گر جان فنا نہ رواست۔ تو نے اپنے زمانے میں چاہے کیسے ہی مظالم کیے ہوتے اور چاہے کتنی ہی تکلیفیں پہنچائی ہوتیں۔ تیرا ایک آخری فردہ ایسا تھا جو سب پر بالا ہو کے سارے ہجوم آلام کو سامنے سے ہٹا دیتا اور یہیں ایسا نظر آتا کہ گویا کوئی رنج تھا ہی نہیں۔

مگر اس فردہ کے سننے سے پہلے بھی تو نے ملک میں ہر طرف بڑی جہل پیل پیدا کر رکھی تھی جو باتیں کسی عہد میں نہیں ہوئیں اور جن سے ہندوستان کی تاریخ بالکل نا آشنا ہے تیرے اس حقیر عہدے تاریخ پلٹ دی جو ملک مشرقی بادشاہ پرستی اور بادشاہ کی زبان کو ملک کا قانون سمجھنے کا عادی ہو اسی ملک میں رعایا کو حکومت میں حصہ مل جانا اور اُس کے نائبین کا دائرہ سارے سے لے کے وزیر

ہند تک کی کونسلوں میں شریک ہو جانا ایسی باتیں ہیں جو اسے جانے دئے سال تیرے نام کو قیامت تک روشن رکھیں گی۔

اسے خیر باد تو نے ہمارے ساتھ ہر طرح بھلائی ہی کی۔ اور تیرے اتنے احسانات ہیں کہ ہم سے بن نہیں پڑتا کہ عذر شکر کس کس مہربانی کا کریں تیری ادب کا نشان سب باتوں کے ساتھ اہل ہند کو اتنی سمجھ بھجی تھی کہ ملکی نفع کو قومی نفع پر اور قومی نفع کو شخصی نفع پر ترجیح دیں۔ اور ان ذلیل مخالفوں سے باز آئیں جو انھیں روز بروز زیادہ ذلیل کرتی جاتی ہیں مگر اس کو تو کیا کرے بہ جس قوم اور جس گروہ کی قسمت ہی اُلٹی ہو جس کے اور شخصی اور ذاتی منافع پر سارے ملک کے قربان کر دینے کو آمادہ ہوں۔ اُس کے لیے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔

خیران بھٹیوں کو تو ان کے حال پر چھوڑ۔ اور خوش جا۔ کیونکہ اپنے جانے کے وقت تو ہم سب کو بھی خوشی اور طرح طرح کی دلچسپیوں میں مصروف و مشغول چھوڑ چلا ہے۔ ہر جگہ بڑے دن کی خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ آسمانی امیدوں کا نیا پارسل آسمان سے اتر کے ہمارے قریب پہنچ چکا ہے اور نیو ایس ڈسے یعنی سال نو کے پہلے دن انتظار نے ساری دنیا میں ایک ہی دق و شوق پیدا کر دیا ہے۔ ”الہ آباد کی نمائش کھلی ہوئی ہے۔ جو دنیا کی ترقیوں کے تمام مکمل نمونے اہل ہند کے سامنے پیش کر کے اُن کی آنکھیں کھول رہی ہے۔ اُس کے پاس نیشنل کانگریس میں وطن پرستان ہند اپنی آزاد دیوتا اور اپنی آتش بانیوں سے برٹش تاج کی برکتوں اور کرامتوں کا ثبوت دے رہے ہیں۔ کین مسلم لیگ انجو نیشنل کانفرنس میں شریک ہو کے اپنی ملی ترقیوں کے تدابیر سوج رہے ہیں۔ اور کین انھوں نے مسلم لیگ کا جھنڈا بلند کر کے اپنے پائلٹس اور اپنے تمدن کے مسائل چھڑے ہیں۔ انفرنس جہد کر کے لطف و مسرت دلچسپیوں اور گرجو شیون ہی کے سامانی نظر آ رہے ہیں لہذا اسے تو ہمیں متروک و متفکر نہیں بلکہ متحرک و شاد کام اور خوشی لے جتن مناتے ہوئے چھوڑے جاتا ہے۔

بڑی ناشکری ہوگی اگر اس موقع پر ہم تیرے ان احسانات کو نہ ظاہر کریں جو خاص اہم پر اور ہمارے دگلدار پر ہوئے ہیں۔ دگلدار کے لیے سچ یہ ہے کہ تو تمام گزشتہ تین سے اچھا اور خوش نصیبی کا سال تھا۔ دگلدار خدا سے یہ آندہ کر کے کہ

یوسف اقبال بچا ہم رسان
پہچو ز لہجہ بشبا ہم رسان

اور از سر نو عالم طوبی کی وضع اختیار کر کے تیرے گوارے میں لیٹا تھا۔ جسے تو نے اچھے دنگ دیے۔ اور اپنی آغوش شفقت میں بڑی دیر و مندی سے پالا۔ سال جبرہ برابر وقت پر ضائع ہوتا رہا۔ ابتدا ہی

شش ماہی میں تو اسی وضع و حالت پر تھا جو کہ شروع میں حتیٰ مگر دوسری شش ماہی کے شروع ہوتے ہی اُس کے اور باقی بھی بڑھ گئے۔ اور کاغذ لکھائی چھپائی اور حرثیت سے اُس نے بے انتہا ترقی کی۔ پہلے پھر مہینہ دو ایک مضامین دیگر جادو نگاروں کے بھی تھے مگر اُس کے بعد ہی سے قدر دانوں کا اصرار دیکھ کر اُس نے پابندی کر لی کہ اُس کے صفحات پر سو اڈیٹر کے اور کسی کی کوئی تحریر نہ ہو اگر کسی مضامین بھی اس سال دیگر مہینوں کے دیکھتے بہت اچھے رہے۔ دگلدار کا اس سال کا تاریخی ذخیرہ بہت نیا اور بہت زیادہ ہے۔ یوں تو تاریخی مضامین بہت سے پرچون میں شایع ہوتے رہتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو جیسے تازہ۔ نئے۔ اچھوتے۔ اور ضروری واقعات تاریخی ان بارہ مہینوں میں دگلدار نے پیش کیے ہیں اور کوئی کم بیش کر سکا ہو گا۔ پھر اُس کے ساتھ دگلدار کی ادبی خصوصیت یعنی جلیبی زبان جلیبی الفاظ جلیبی رنگ۔ اور جس مستند اور محسب لٹریچر میں دگلدار نے اُن واقعات کو بیان کیا یہ اُسی کا کام تھا۔ اور اُسی پر ختم ہے۔ ہمارے اس سال کے خیالی مضامین جن کے ذریعہ سے نثر میں کمال شاعری دکھایا جاتا ہے اگرچہ سابق کی بہ نسبت کم رہے۔ کیونکہ اب زمانہ خالص لفظی اور ہوا میں خیال کے قلعہ بنانے کو زیادہ پسند نہیں کرتا لیکن جتنے تھے ایسے تھے کہ قدر دانوں نے انھیں بہت پسند فرمایا۔

اسے ۱۹۷۶ء میں تیرے ہاتھوں دگلدار کی جو کچھ اصلاح ہوئی ہر طرح قابلِ شکر گذاری ہے۔ اور اُس سے بھی زیادہ بڑھا ہوا تیرا یہ احسان ہے کہ تو نے ملک میں دگلدار کو زیادہ سرخرو کیا جس کا ثبوت اس سے بڑھ کے کیا ہو سکتا ہے کہ جنوری ۱۹۷۶ء کے آخر میں جب پہلا نمبر نکلا ہے اُس وقت اس کی اشاعت ۴۰۰ سے زیادہ نہ تھی اور اب بفضلہ تعالیٰ ۱۴۰۰ سے زیادہ ہے۔

ہم نے وعدہ کیا تھا کہ جب اس کی اشاعت ۱۲۰۰ سے بڑھے گی اُسے بجائے ایک جڑ کے ڈیڑھ جڑ کا کر دیں گے چنانچہ وہ وعدہ پورا کیا گیا۔ اور اب کہتے ہیں کہ جس دن اس کی اشاعت ۲۴۰۰ کو پہنچے گی اُس دن اسی قیمت میں اسے دو جڑ کا رسالہ بنا دیں گے جس میں امید کو یقین ہے کہ وہ قدر دان و قدر افزا جن کے آغوش شوق میں اسے ۱۹۷۶ء دگلدار کو تو چھوڑ چلا ہے مگر پورا کر دیں گے۔

لوگوں کو ناول کے نہ ہونے کی شکایت تھی۔ مگر میں بھی مناسب معلوم ہوا کہ مجھے متفرق اجزا شایع کرنے کے ناولوں کو مکمل کر کے ناظرین کے ہاتھ میں دے دیا کریں۔ چنانچہ تاریخی ناول ”فلپانا“ جس کے متعلق ہر طرف تحسین و مہربانی آوازیں آرہی ہیں شایع کر دیا گیا۔ اور ایک نیا سوشل ناول ”غیب دان دلہن“ آئندہ مہینہ میں بلا قیمت اور بدینہ نذر ناظرین کیا جائے گا۔ صرف ایک روپیہ میں ایسے مضامین ایسا کاغذ ایسی چھپائی اور پھر ایک ناول کا مفت نذر کیا جانا بہت زیادہ ہے۔

اور اپنے جوش سے بڑھی ہوئی جرات ہے۔ مگر اسے ۱۹۱۰ء میں تیری ہی حوصلہ افزائی میں جو بوری بہت بندھا کے ہیں اپنے کم فرماؤں اور مہربانوں کی خدمت گزاری پر آمادہ کر رہے ہیں۔

لہذا جا خوش خوش جا اور خرد جو بی سے جا۔ مگر جانے سے پہلے اتنی مہربانی اور کر تا جا۔ کہ آنے والے سال ۱۹۱۱ء سے ہیں دو کلہ اخیر کے ساتھ انٹر ڈیوٹس کرادے۔ اور اُس نے زمانہ کا چارج لینے والے سے سفارش کر دے کہ تیری طرح اس کا سلوک بھی ہمارے ساتھ اچھا رہے۔ اور جیسا تو ہمارے حال پر مہربان تھا وہ بھی رہے۔

مصنف عثمانی

قرآن مجید کی نسبت لوگوں میں عموماً مشہور ہے کہ اسے حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جمع فرمایا ہے اس معاملہ کے متعلق علماء اور مورخین میں بہت کچھ اختلافات پڑے ہوئے ہیں خصوصاً شیعوں کے شرمناک جھگڑوں نے اسے اور زیادہ اُجھارا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ عثمان اسلام علی الخصوص عیسائیوں کو قرآن پاک کی تحریف کے متعلق کچھ کہتے اور جھگڑنے کا موقع مل گیا۔

اس واقعہ کی اصلیت اسی قدر ہے کہ عرب کے مختلف حصوں اور عربوں میں مختلف لغات بولے جاتے تھے یعنی زبان ایک ہی تھی مگر لہجہ میں اور بعض حروف کے نفاذ اور تلفظ میں فرق تھا جس سے یہ خطر آتا تھا کہ ظاہر ہو کہ ان صوہجات عرب میں لوگوں نے اپنے تلفظ ہی کے مطابق قرآن کو لکھنا بھی شروع کر دیا۔ اسکی مثال آج کل کے اعتبار سے یوں سمجھئے کہ اکثر مقامات کے عرب حرف "ق" کا تلفظ گاف اور حرف "ث" کا ت کرتے ہیں۔ اب یہی لوگ اپنے لہجے اور تلفظ کے مطابق ق کی جگہ گاف اور ت کی جگہ ت لکھنے بھی لگے تو خواہ مخواہ زبان کے بگڑ جانے اور قرآن میں اختلاف پڑ جانے کا اندیشہ ہوگا۔ اسی اندیشہ سے محفوظ رکھنے کے لیے حضرت عثمان نے یہ کارروائی کی کہ صحابہ میں سے جو جو بزرگ قرأت قرآن میں کمال رکھتے تھے اور جن کی قرأت پر پھر وساطتاً ان کو جمع کر کے خاص قریش کے لہجے اور تلفظ کے مطابق املا کو مدون کر دیا۔ تاکہ پھر کوئی جھگڑا نہ باقی رہے۔ یا اس واقعہ کو آج کل کی زبان میں زیادہ صحیح طور پر یوں کہا جائے کہ حضرت ذی النورین نے قرآن مجید کا ایک مستند ایڈیشن دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اور عربوں کے اختلافات لغت سے الفاظ کے بگڑنے یا بدل جانے کے جو اندیشہ تھے مٹا دیے اسی اعتبار سے حضرت عثمان جامع قرآن کہے جاتے ہیں اور نہ قرآن کی ترتیب و تہذیب تکمیل دین ہی کے ساتھ جو کچھ تھی سورتوں میں آیات کی ترتیب۔ اور سورتوں کی باہمی ترتیب سب حضرت صالح کے

سانسے کی باتیں ہیں۔ ان کو ترتیب عثمانی سے کوئی علامتہ نہیں۔ اور نہ کسی کو ایسی جرات ہو سکتی تھی کہ انھیں
کی ترتیب میں کسی قسم کا دخل دے۔

تبع روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اپنے اس مستند ایڈیشن کے پانچ نسخہ تیار کر رکھے تھے۔
جن میں سے ایک کمرہ معظمہ میں بھیجا یا ایک بقرہ میں بھیجا۔ ایک کو تہ روانہ کیا۔ ایک شام (دشمن)
میں اور ایک اپنے پاس مدینہ طیبہ میں رکھا۔

علامہ ابوالقاسم حمیدی (سبطی) جو اسی شہر سبط کے رہنے والے تھے جس کا سین ہم اپنے ناول
فتح اندلس میں دکھا چکے ہیں اور جہان کے حاکم جوین سے مل کے مسلمانوں نے اسپین کے فتح کرنے کا
ارادہ کیا تھا، بیان کرتے ہیں کہ شام والا قرآن (مصحف عثمانی) دمشق کی جامع بنی امیہ میں اُس کی حرا
کے اندر رکھا ہوا ہے جس کی میں نے سترہ سو مین خود اپنی آنکھوں سے زیارت کی۔ اور کمرہ معظمہ والے
قرآن کو میں نے قبۃ یسویہ (ہم نہیں بتا سکتے کہ یہ قبہ کون اور کہاں تھا) میں دیکھا تھا۔ ان کے
ایک صدی بعد ایک اور مصنف، جن کا نام عبدالملک ہے فرماتے ہیں کہ میں نے اُن دونوں کو
کی اور نیز مدینہ والے مصحف عثمانی کی سترہ سو مین زیارت کی تھی۔

ان میں سے ایک مصحف تھا جس نے کیونکر ارض اندلس میں پہنچ گیا جو وہاں قرطبہ کی جامع مسجد
میں ایک مدت تک ادب و عظیم سے رکھا رہا۔ لوگ ذوق و شوق سے اُس کی زیارت کرتے اور اُس سے
فیض و برکت حاصل کرتے رہے۔ علامہ عبدالملک جنھوں نے سترہ سو مین کمرہ اور مدینہ والے
قرآن کو دیکھا تھا فرماتے ہیں کہ اندلس والے اور مدینہ والے قرآن کا خط ایک ہی تھا۔ جس سے
معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی شخص کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔

بعض عوام تصور کرتے ہیں کہ ان قرآن کو حضرت عثمان نے خاص اپنے دست مبارک سے لکھا تھا
مگر اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ آپ کے ہاتھ کا لکھا ہو کوئی قرآن نہ تھا۔ لیکن جس ہاتھ سے وہ لکھے گئے
ہوں گے یقیناً وہ برکت کا ہاتھ تھا کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربین صحابہ میں سے کسی بزرگ
سے ہاتھ سے لکھے گئے ہوں گے۔ جن علمائے ان مصاحف عثمانی کی زیارت کی تھی وہی اپنے معائنہ اور
مشاہدہ سے بیان کرتے ہیں کہ مدینہ والے قرآن کی نسبت پر یہ عبارت لکھی تھی۔ ”یہ وہ (قرآن) ہے
جس پر اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جماعت نے اتفاق کیا بخملاً اُن کے زیر بن ثابت عبدالدرین نے
اور سعید بن عاصی ہیں۔“ اور اسی سلسلہ میں اُن تمام صحابہ کے اسمائے گرامی لکھے ہوئے ہیں جنہیں
حضرت عثمان نے اس اہم کام کے لیے جمع فرمایا تھا۔

اہل اندلس کا اپنے قرآن کی نسبت یہ خیال بھی تھا کہ یہی وہ قرآن ہے جس پر شہید ہوئے
وقت حضرت عثمان کا خون گرا تھا۔ مگر اس کو علامہ مرقی اپنی کتاب "نفع الطیب" میں (جس سے اخذ کر کے
ہم یہ واقعات ناظرین دولگانہ کے سامنے پیش کر رہے ہیں) بعید از قیاس بتاتے ہیں۔ اور فرماتے
ہیں کہ وہ ہو گا بھی تو شام والہ قرآن ہو گا۔

لیکن ہمارے نزدیک اگر اس قرآن میں خون کے دھبے موجود ہوں تو اندلس والوں ہی کا خیال
ٹھیک ہے۔ کیونکہ شام کا قرآن جس کی عشتہ میں ابو القاسم نجیب نے زیارت کی تھی وہ ہو گا ہے
حضرت عثمان نے اپنی زندگی ہی میں ارسال فرمایا تھا اور جس پر آپ کا خون گرا وہ آپ کے خوبی و
اکرتے اور آپ کی بی بی عائشہ کی کٹی ہوئی انگلیوں کے ساتھ دمشق میں آپ کے بعد بھیجا گیا ہو گا۔ اور غالباً
وہ آپ کا خاص قرآن ہو گا جس میں آپ خود تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ اور اہل مدینہ کی عام نفع رسانی کے
لیے ایک دوسرے نسخہ ہو گا جو آپ کے بعد صدیوں تک وہاں موجود رہا۔ تاہم ہمیں ابھی تک اس کا پتہ نہیں
چلا کہ اندلس میں وہ قرآن کس زمانہ میں اور کیونکر پہنچا ؟

لیکن اس میں شک نہیں کہ اہل اندلس اس کی نہایت ہی قدر و منزلت اور تعظیم و تکریم کرتے
تھے۔ یہاں تک کہ اندلس کی سلطنت میں کمزوری پیدا ہوئی اور مراکش میں سلاطین موحدین کا دور
شروع ہوا جنہوں نے سارے سپین کو مغلوب و معنور کر دیا تھا۔

اس خاندان کے بانی اور پہلے تاجدار ابو محمد عبد المومن بن علی کو اس مسند اور تبرک نسخہ قرآن کے اپنے
اور سلطنت مراکش میں لے جانے کا یہی شوق تھا۔ اسی کے وزیر عبد المومن ابو بکر محمد بن عبد الملک بن
طفیل کا بیان ہے کہ اس قرآن کے اہلی صحیفہ عثمانی ہوئے میں کسی کو شک نہ تھا۔ چنانچہ خلفائے اندلس
اور سلاطین ہمیں نسلاً بعد نسل اس کی حفاظت اور عزت کرتے آئے تھے۔ بادشاہ عبد المومن کو بڑی آرزو
تھی کہ اسے قرطبہ سے منتقل کر کے مراکش میں لے آئے مگر محض اس خیال سے اس کی جرات نہ کرتا تھا کہ
مسلمانان قرطبہ کو اس کا بڑا ملال ہو گا۔ اور ان کی دشمنی کرنا اچھا نہیں۔ مگر خدا نے خود ہی یہ بات طہم
دالون کے دل میں ڈال دی۔ اور وہ آپ ہی آمادہ ہو گئے کہ اس دولت گران باکو عبد المومن کے
حوالہ کر کے حق کو حق دار کے پاس پہنچا دیں۔ چنانچہ قرطبہ کے دور میں زادے ابو سعید اور ابو یوسف
میں اس قرآن مجید کو لے کر مراکش میں آئے جس کا استقبال وہاں بڑی دھوم دھام اور بڑے
ترک و اعتشام سے کیا گیا۔ بادشاہ عبد المومن کو اس نعمت غظمی کے ملنے پر بڑی خوشی ہوئی۔ اور اس نے
اس مصحف کی حفاظت اور اس کی زیارت کے لیے جو اہتمام کیا حیرت انگیز ہے چنانچہ اس کا مفصل

حال ہم اسی مضمون میں آگے چل کر بیان کریں گے۔

عبداللہ بن مسعود کے عہد سے اس ودیعت ربانی کے حامل سلاطین موحّدین ہوئے جو علی العموم انہی کے بے انتہا قدر کرتے تھے۔ اور حصول برکت کے لیے سفرون اور لڑائیوں میں اُسے اپنے ساتھ لے جاتا کرتے تھے۔ انہیں میں سے بادشاہ منصور نے اس قرآن مجید کی جلد پر سونے کے حرفوں میں چار شعر لکھوائے تھے جن میں سے آخری شعر یہ تھا۔

والسبتہ الیا قوت والذرحلیۃ
و غیر ک قدر واہ من دم صاحبہ

(تو نے تو اسے یا قوت اور موتیوں کا زیور بنجایا۔ اور دوسروں نے اسے خود اُن بزرگ (حضرت عثمان) کے خون سے سیراب کیا جن کا یہ تھا)

انہیں موحّدین میں سے معتضد یعنی سعید علی بن مامون ۳۲۵ھ میں جب تلمسان کے سفر پر روانہ ہوا تو عادت کے موافق اس قرآن مجید کو اپنے ہمراہ لیتا گیا تھا۔ تلمسان کے قریب وہ اور اُس کا بیٹا ابراہیم دونوں لڑائی میں مارے گئے اور بدوی عربوں اور دیگر افریقی قبائل نے جہاں شامی لشکر گاہ کی اور سب جن لوگوں اس مصحف عثمانی کو بھی لے گئے۔ اب چند روز تک یہ قرآن مجید گنہمی میں رہا۔ مگر بعض کہتے ہیں کہ وہ تین شہان تلمسان کے خزانہ میں تھا، یہاں تک کہ آخر ماہ رمضان ۳۲۵ھ میں بادشاہ ابوالحسن نے جو بنی مرین میں سے تھا تلمسان کو فتح کر کے یہ مصحف عثمانی اپنے قبضہ میں کیا۔

اب بادشاہ ابوالحسن نے اسے ذریعہ برکت قرار دیا۔ اور یہود کے تابوت سلیمہ کی طرح لڑائیوں اور جہاد کے سفرون میں اسے ساتھ ساتھ لیے پھرتا تھا۔ اُس نے اتفاقاً پورچوگل کے شہروں پر یورش کی جس میں وہ دشمنوں کے زخمین پڑ کے مارا گیا۔ اور یہ قرآن اُس کے دشمنوں کے ہاتھ لگا۔ اب کسی تاجر نے حسن تدبیر سے اُس کو اُن لوگوں سے حاصل کیا۔ اور ۳۲۵ھ میں پھر مرکش میں آگے شہر فاس کے خزانہ میں رکھ دیا۔

بس اس کے بعد ہم نہیں جانتے کہ وہ قرآن کہاں ہے۔ آیا وہ محترم نسخہ آج بھی شہر فاس میں ہے یا نہیں۔ فی الحال ایک قرآن مجید اور وہی خاص جس پر حضرت عثمان کا خون گرا تھا قسطنطنیہ میں دولت عثمانیہ کے قبضہ میں بتایا جاتا ہے ممکن ہے کہ یہ وہی قرآن ہو۔ اور کسی ذریعہ سے سلاطین آل عثمان کے قبضہ میں آگیا ہو۔

لیکن ہمیں ابھی اتنا بتانا باقی ہے کہ پہلے زمانہ روائے موحّدین عبداللہ بن علی نے اس کی قدر وانی و حفاظت کے لیے کیا کیا انتظامات کیے تھے۔ اُسے اس قرآن کے ملتے ہی اس

بات کی فکر ہوتی کہ جیسا یہ عجیب نما کلام ہے۔ ویسی ہی اس کی رحل اور اس کے رکھنے کا تابوت (مصدق) بھی ہو۔ جن سے ایک طلسم اور معجز ثانی کی شان نمایاں ہوتی ہو۔

چنانچہ اس غرض کے لیے اُس نے اپنے دار السلطنت مراکش (جو ان دنوں ایک بڑا ترقی یافتہ اور تمدن شہر تھا) کے اور نیز اپنی فکر کے بلادِ دورد دراز کے بڑے بڑے مہندسون۔ نقاشون۔ معمارون۔ تجارون۔ سادہ کارون۔ نگینہ جڑنے والون۔ اور صحافون غرض ہر قسم کے کاریگروں کو بلا کے شہر مراکش میں جمع کیا۔ اور ان کو حکم دیا کہ تم سب مل کے باہمی مشورہ سے اس قرآن کی جلد بناؤ۔ اُس میں جو اہر ات جڑو۔ اور اُس کے لیے اعلیٰ درجہ کا ایک جزدان بناؤ۔ اور یہ سب چیزیں ایسی ہوں جو ابوبہ و زکاء ہوں۔ پھر اُس کے لیے ایک کرسی اور ایک رحل اور ایک ایسا تابوت تیار کرو جس میں اپنی ساری ضاعی عرف کر دو۔ اور ایسا کمال دکھاؤ کہ یہ سب چیزیں ایک طلسم معلوم ہوں۔ اور ان سے ایسے عجائبا ظاہر ہوں جن کے اسباب نظر سے پوشیدہ رہیں۔

یہ ایک نئی کام تھا جس میں اجر و ثواب آخرت کے علاوہ بادشاہ کی خوشنودی بھی مقصود تھی۔ کاریگروں نے جانیں لڑوین۔ پہلے تو اُس کلام اللہ کے لیے سونے چاندی کی ایک مریض کار جلد اس وضع کی بنائی گئی کہ اُس میں زیادہ تر کس کی شان تھی۔ اندر باہر بڑے خوبصورت رکھی گئی تھیں۔ اور ہر جگہ ایسے نقش و نگار تھے جن میں ہر مقام پر ایک نئی صفت نظر آتی تھی۔ اُس پر رومی شیشہ کی ایسی مینا کاری کی گئی تھی کہ اُس سے پہلے کبھی لوگوں کی نظر سے نہیں گذری تھی اس جلد میں حیرت انگیز طریقہ سے ہر مقام پر جوڑتھے جو بند ہوتے وقت خوب چمکے بٹھکے جاتے۔ اور کھلتے وقت جدا ہو جاتے۔ اور ایسی خوش سلوکی اور عمدہ ترتیب سے اُس جلد پر ہرے یا قوت زہر اور موتی جڑی گڑھے تھے کہ اُس کی آب و تاب پر نظر نہ جم سکتی۔ پھر اُس کے لیے سندس و حریر کا ایک نہایت ہی پر تکلف جزدان تیار کیا گیا۔ اور اس میں بھی بہت ہی بیش بہا جواہر کثرت سے ٹانگے گئے

اس کے بعد اُس قرآن مجید کے واسطے ایک آبنوس کی مریض کار رحل بنائی گئی اور اُس میں بھی اعلیٰ درجہ کے نقش و نگار بنا کے کجا بجواہر ات جڑی گئی۔ اس رحل کی وضع بھی نہایت خوشنما اور عجیب تھی۔ پھر ایک نہایت نازک خوبصورت اور پر تکلف کرسی بنائی گئی تاکہ اُس کرسی پر رحل اور رحل پر قرآن پاک رکھا جائے پھر ایک بڑا سا تابوت (مصدق) بنایا گیا تاکہ اُس کے اندر وہ کرسی اور رحل اور قرآن حفاظت کے ساتھ رکھے رہیں۔ اور جب کہیں لیجانا ہو تو اُس پورے تابوت کو اٹھا کے بجایا کریں۔ یہ تابوت شش پہل تھا۔ بہت بلند تھا۔ اور نہایت خوشنما۔ اور اُس پر چاروں طرف ایسے نقش و نگار بنائے گئے

تھے کہ جو کھیتا عیش عیش کر جاتا۔

مگر سب سے بڑا اہل یہ تھا کہ اس خیال سے کہ بغیر ہاتھ لگائے قرآن کی زیارت ہو جایا کرے اور حضرت جل و علا کے اسل رساؤ کی کہ ”لَا مِثْلَہٗ لَہٗ لَاطْمَرْدُنَ“ کی پوری تصدیق ہوتی رہے اس تابوت کرسی اور رُحل میں کچھ ایسی کلین لگائی گئی تھیں اور انکی تکلیں میں ایسا کمال انجیری صرف کیا گیا تھا کہ انھیں دیکھ کے عقل دنگ رہ جاتی۔ اور قرآن مجید کی زیارت میں ایک معجز نامی کا حیرت انگیز کرشمہ لوگوں کو نظر آ جاتا۔ جب کسی کو اُس کی زیارت کا شوق ہوتا تو اُس شش پہل تابوت کے ایک پہلو پر جو دوپٹ لگے ہوئے تھے اُن کے نیچے ایک سوراخ میں ایک نازک سی خوبصورت کبھی ڈال کے پھرائی جاتی کبھی کے پھرتے ہی آپ سے آپ دونوں پٹ یکایک کھل کے اندر کی طرف ہڑ جاتے۔ وہ کسی جس پر رُحل تھی۔ خود بخود تابوت سے باہر دوڑ آتی۔ اور رُحل مع قرآن بھی خود بخود حرکت کر کے اُس کرسی پر کھسک گئے انتہائی سرے پر آ جاتی۔ اور یہ سب حرکتیں ایک ہی ساتھ صرف کبھی کے پھرانے سے بغیر اس کے کہ کوئی ہاتھ لگا ہو میں۔ اور قرآن مجید زیارت کرنے والوں کے قریب آ جاتا۔ پھر بعد زیارت جب اُسے احتیاط کے رکھ دینا منظور ہوتا تو کبھی اُسی سوراخ میں ڈال کے دوسری طرف پھرائی جاتی اور ساتھ ہی کرسی اور رُحل مع قرآن مجید کے آپ سے آپ اندر ہو کے اپنی اپنی جگہ پر قائم ہو جاتے۔ اور خود ہی تابوت کے پٹ بھی بند ہو کے مقفل ہو جاتے۔

مسلمانوں اور خصوصاً آج کل کے تعلیم یافتہ لوگوں کو اُس زمانہ میں اور وہ بھی مراکو میں ایک ایسی صنعت کے پانے جانے کا مشکل سے یقین آئے گا۔ مگر یہ گل باتیں کتاب نفع الطیب کی جلد اول میں بروضاحت درج ہیں جو کہ آج کل کی تصنیف نہیں۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ اُس کے بیان کو جو مستند مؤرخین کے حوالہ سے ہے بے اہل تصور کر لیا جائے۔

مگر ان خود ہماری حالت ایسی ہو رہی ہے کہ ایسے کمالات کا اب ہمارے اگلے بالکل بزرگوں کی جانب منسوب کیا جانا بھی اور دن کو نہیں خود ہمارے ہم قوموں کو قابل حیرت نظر آتا ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ ہمارے بزرگ ایسے نہ تھے جیسے کہ ہم ہیں۔

اردو لٹریچر اور محکمہ قوانین

اُردو زبان خوش اقبال میں بھی نصیب ہے۔ اُس کی تاریخ بتا رہی ہے کہ اُس کو جب کبھی ضرر پہنچا ہے خود اپنوں اور اپنے مربیوں سے پہنچا ہے۔

ہر کس از دست غیر نالہ کند سعدی از دست خوشنقز فریاد

جن ہندو اور مسلمانوں کے امتزاج و اتحاد میں جوں و بہا ہی ربط و ضبط سے وہ پیدا ہوئی انھیں نے ابتداءً سو ایک مگر یوں زبان سمجھنے کے اُسے ہمیشہ علمی دربار سے محروم رکھا۔ اور اب بھی دیکھ لیجئے کہ وہی لوگ جو اس کو بولتے اسے برتتے اس میں مراسلت نامہ و پیام اور تصنیف و تالیف کرتے اور اس میں اخبار نکالتے ہیں وہی اس کے دشمن ہیں۔ اور جب پوچھو تو یہی کہتے ہیں کہ میں اردو سے کوئی تعلق نہیں اور نہ یہ ہماری زبان ہے۔ سرکار برطانیہ جس نے اسے علمی دربار میں پہنچایا۔ سرکاری زبان بنایا۔ سلطنت کے قوانین اس میں مدون کرائے۔ شہروں شہروں اور گاؤں گاؤں میں اسکی تعلیم کے مدرسہ جاری کیے۔ اُسی کے بعض افسر اردو کے خلاف ہیں اور اُس کی ترقیوں کو اچھی نظر سے دیکھتے۔ اور اگر اس پر عنایت بھی کرتے ہیں تو بے نصیبی سے وہی عنایت جو موجب مفرت بن جاتی ہے۔

مہرشتہ تعلیم میں چونکہ ہندو غلبہ غالب ہے اس لیے اگر اور کچھ نہیں بن پڑتا تو اسی بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ نصاب تعلیم کی کتابوں کی زبان ہی بگاڑ کے غارت اور گنواروں کی زبان سے بھی بدتر کر دی جائے مگر اس کے علاوہ ایک اور حیثیت سے بھی اردو بگاڑی جا رہی ہے جو اس سے بھی زیادہ قابلِ لحاظ ہے۔ اور وہ حیثیت مہرشتہ ترجمہ قوانین کی ہے۔

اردو زبان کو ہندوستان کی دوسری زبانوں مختلف حیثیتوں سے ترجیح حاصل ہے منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ دیگر اقوام و السنہ سے جس قدر علم و فن ہندوستان کی لٹری دنیا میں آتا ہے وہ زیادہ تر اردو ہی میں ہوتا ہے۔ ہندوستان جسے بجائے خود ایک براعظم کہنا چاہیے اس کی تقریباً نصف آبادی اردو بولتی اور سمجھتی ہے جس کی وجہ سے دوسری زبانوں سے صحتی کتابیں یا چیز ترجمہ ہوتی ہیں اکثر اردو میں ہوتی ہیں۔ ان ترجموں کا سلسلہ ایک مدت دراز سے اردو میں جاری ہے جن کی بدولت اردو میں اتنا وسیع اور غیر محدود لٹریچر پیدا ہو گیا ہے کہ اُسے تکمیل کے ساتھ جھک کر دنیا کسی بڑی سے بڑی لائبریری کے بھی امکان میں نہیں ہے۔ ہنگامی۔ مریٹی۔ گجراتی اور تلنگی زبانوں میں بھی ترجمہ ہے ہیں۔ مگر اردو کے مقابل بہت کم۔ اور اتنے ہیں کہ اُن کی مجموعی تعداد اردو ترجموں کے عشر عشر کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔ اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ جہاں تک خاص اردو کی تباہی و بے اُس میں اُن زبانوں کو کوئی جانتا بھی نہیں اور اُن کے خاص رقبہ میں اردو پوری طرح حکومت کر رہی ہے ہنگامی۔ گجراتی۔ مریٹی اور تلنگی زبانوں کے لئے پھر کوئی آباد سے پیشا و تک کوئی جانتا بھی نہیں

مگر اردو لٹریچر کی اشاعت جیسی لکھنؤ اور دہلی میں ہے اُس کے قریب ہی قریب کلکتہ - بمبئی - پونا اور مدراس میں بھی ہو رہی ہے۔ اور اسی وجہ سے اُن زبانوں کا دائرہ بہت ہی محدود ہے اور اُن میں ویسی علمی وسعت ہرگز نہیں جیسی کہ اردو میں ہے۔

دنیا کی تمام زبانوں کو سب سے زیادہ علمی فائدہ ترجموں ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوا کیا ہے۔ کیونکہ ترجمہ کی معرفت جب نئے مضامین اور نئے خیالات کسی زبان میں آتے ہیں تو اپنے لیے نئے الفاظ محاورات اور مصطلحات بھی پیدا کر لیا کرتے ہیں جن سے زبان کو روز بروز وسعت حاصل ہوتی جاتی ہے۔ ہندوستان میں مختلف زبان بولنے والی قومیں اور مختلف مذاق و اعتقاد و خیالات کے لوگ موجود ہیں جن کی وجہ سے یہاں کوئی ایک قومی اور ملکی اکاڈمی نہیں قائم ہو سکتی جیسی کہ فرانس میں نظر آتی ہے جہاں ایک ہی زبان بولنے والوں اور ایک ہی مذاق رکھنے والوں کی متحدہ کوششیں فریج اکاڈمی کے ذریعہ سے فرانسیسی لٹریچر کو یوں اُفوا کرتی دلاتی رہتی ہیں۔

سنان پچ پوچھے تو ایسی کسی اکاڈمی کا قائم مقام صحیح معنوں میں گورنمنٹ کا محکمہ ترجمہ قوانین ہے جس کے ذریعہ سے تمام قانون کے ترجمہ برابر اردو میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اور جو اپنی شاعت کے ساتھ اردو میں بہت سے نئے الفاظ نئے محاورے اور نئے مصطلحات پیدا کرتا ہے اور وہ شائع ہوتے ہی ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔ کتابین گورنمنٹ کے ایما اور حکم سے اس محکمہ کے ذریعہ سے شائع ہوتی ہیں۔ ان کو اشاعت کے ساتھ ہی جیسی مقبہ است اور تصحیح حاصل ہو جاتی ہے ویسی نہ کسی شاعر کے کلام کو نصیب ہو سکتی ہے اور نہ کسی ادیب کی عبارت کو۔ وہ ترجمہ فوراً مستند تسلیم کر لیا جاتا ہے اور عدالتوں و تمام محکموں پر متاثر ہو جاتا ہے۔ اور اُن کے استناد کیا جانے لگتا ہے۔ اور اُن کا ہر لفظ چاہے بُرا ہو یا اچھا محاورہ ہو یا بے محاورہ ایک مہمان ناخواندہ کی طرح زبان میں زبردستی گھس پڑتا ہے۔

جہاں تک مجھے تجربہ ہوا ہے ان قوانین کے ترجموں میں کثرت سے خلاف محاورہ بلکہ غلط الفاظ استعمال ہوا کرتے ہیں۔ اور اُن سے زبان کو بچاے فائدہ کے ضرر پہنچتا ہے۔ لوگ اطاعت کشی اور نیاز مندی کے جوش میں اُن غلط اور خلاف محاورہ ترجموں کو مجبوراً قبول کر لیتے ہیں۔ اور اُن پر حرف رکھنے کی جرأت نہیں کرتے جس کی وجہ سے جہاں یہ کہنے کا موقع حاصل ہے کہ خود گورنمنٹ کی صہبانی سے زبان بچائے سُدھرنے کے بکڑ رہی ہے۔ اور جس اکاڈمی سے یہاں فائدہ پہنچنا چاہیے تھا اُس کی ضرر اٹھا رہی ہے۔

لوگ جو ان ترجموں کو عموماً قبول کر لیا کرتے ہیں اس سے یہ خیال کرنا چاہیے کہ انھوں نے ترجموں کو صحیح و با محاورہ سمجھ کے قبول کر لیا۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ ضرورت مجبور کر کے ان سے تسلیم کراتی ہے۔ ورنہ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ ہم جن غلطیوں کے ایک جاہل بچہ کی زبان پر بھی تحمل نہیں ہو سکتے انھیں غلطیوں کو سرکاری قوانین میں دیکھ کے برداشت کریں اور انھیں ٹھنڈے ل سے قبول کر لیں۔ خلاف محاورہ الفاظ کے مقبول ہونے پر اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوگا کہ اصل کو ط (تغیرات ہند) کے ترجمہ نے صد ہا غیر مانوس اور زبان پر گران گزرنے والے لفظوں اور لغتوں کو چند ہی روز میں بالکل مانوس بنا دیا۔ حالانکہ ان کی جگہ زیادہ سلیس خوبصورت اور با محاورہ الفاظ استعمال کیے جاسکتے تھے۔

خیر وہ تو ایک گذری ہوئی بات تھی جس کا اب کوئی علاج نہیں۔ مگر غضب تو یہ ہے کہ آج بھی جب کہ اردو لٹریچر بہت ترقی کر گیا ہے سرکاری قوانین کے ترجموں میں بے احتیاطی برتی جا رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان ترجموں کا غلط اور خلاف محاورہ ہونا سخت اعتراض کے قابل ہے یہ غلطیاں کسی اور صنف یا رسالہ سے ہوتیں تو چند ان قابل لحاظ نہ تھیں۔ مگر چونکہ ایک ایسے سرکاری محکمہ سے ہوتی ہیں جس کا ہر لفظ پبلک کو مجبوراً تسلیم کرنا پڑتا ہے اس لیے کسی طرح قابل درگزر نہیں۔ گورنمنٹ کا فرض ہے کہ اس محکمہ کی طرف خاص توجہ کرے۔ اور سوائے مستند زبان دانوں کے اور ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کی جن کی مادری زبان اردو ہو اور کسی کے ہاتھ میں ایسی ذمہ داری کا کام نہ دے۔ کیونکہ اگر یہی بے پروائی اور چند روز رہی تو یہ محکمہ بجائے نفع کے اردو کو سخت ضرر پہنچا دے گا۔ اور اس کی غفلت سے ہماری زبان بگڑ جائے گی۔

فی الحال چونکہ صدر بہار کے لائق و فائق بزرگ انریبل مسٹر علی امام لامبر مقرر ہوئے ہیں جن میں نہایت اعلیٰ درجہ کا لٹری ذوق بھی ہے لہذا ان کی ذات سے ہمیں کامل امید ہے کہ وہ اس جانب خاص توجہ فرمائیں گے۔ اور سرکاری قوانین کے ترجموں کے متعلق ضروری اصلاح فرما کے وہ ہماری زبان اور ہمارے ملک پر خاص احسان فرمائیں گے۔

ہم سب ایک ایجوکیشنل کانفرنس کے صیغہ ترقی اردو کو بھی اس اہم ذمہ داری کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ امید ہے کہ اس بارہ خاص میں وہ سرکار میں ہمارے بڑی زینٹیشن کریں گے اردو کانفرنس جس نے بیدار مغزی سے کام لینا شروع کیا ہے اس کے لیے اس جانب توجہ

کرنے کا پورا موقع ہے۔ اور اگر اُس نے اس شکایت کو رفع کر دیا تو وہ اپنی زبان پر بہت بڑا احسان کرے گی اور اُردو کو ایک ایسی مفرت سے بچائے گی جس سے بچانے کی سخت ضرورت ہے۔

چند مختصر خیالات اور ریویو

مولوی رحمت اللہ صاحب رعد کی نئی نامی جنہری سلمہ کی شایع ہو گئی۔ سچ یہ ہے کہ اگر انسان جنہری رکھے تو یہی نامی جنہری رکھے۔ خصوصاً اس کا اعلیٰ ایڈیشن تو دیکھنے کے قابل ہے۔ اول میں ملک عثمان کی دو تصویروں اور فرمان شاہی کے چھاپنے میں لیتھوگرافی کا اعلیٰ کمال دکھایا گیا ہے اور آخر میں تاریخی افغانستان کا تیسرا حصہ ہے جس میں محمود غزنوی سے آخر عمر شہاب الدین غوری کی تاریخ ہے۔ غنوی محمود غزنوی کے نقشہ اور شہاب الدین غوری کی تصویر سے حضرت رعد کا کمال ظاہر ہو رہا ہے۔ لوگ مولوی رحمت اللہ صاحب رعد کو کانپور کے بہتہ پر خط بھیج کے منگوائیں۔ اور خاص قسم کی جنہری منگوائیں۔

ابو الحسنات حافظ قطب الدین احمد صاحب نے فن طب کی طرف خاص توجہ کی ہے۔ اور اُن کا نامی پریس لکھنؤ۔ سچ یہ ہے کہ طب یونانی پر بڑے بڑے احسانات کر رہا ہے۔ قانون شیخ رئیس کو تمام مکالمات چھاپنے۔ اور زہرا دی کی سی عدیم الخط کتاب کو زندہ کر دینے کے بعد اب انھوں نے مصطلحات طبہ کا ایک کامل لغت جس کا نام لغات طبیہ فی اصطلاحات طبہ ہے مولوی محمد عبدالوہاب صاحب سے تصنیف کرا کے شایع کیا ہے جو ۲۰ x ۲۶ پیمائے کے ۲۵۰ صفحوں پر ختم ہوا ہے اور اُس کے بعد ۴۴ صفحوں پر تشریح کی۔ آلات عمل بالید کی اور دوسرے خارجی علاجون کی تصویریں ہیں۔ ہمارے خیال میں اس کتاب کو طب اور طب کے ہر طالب علم کے پاس ضرور ہونا چاہیے۔ قیمت کچھ نہیں صرف ڈیڑھ روپیہ۔ نامی پریس لکھنؤ خط بھیج کے منگوائی جائے۔

سر ولیم ڈیئر برن ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کر لے آئے ہیں۔ بڑی نوازش۔ ہمارے شہر کے محلہ حیدر گنج میں گاؤ کشی کی بنا پر ہندو مسلمانوں میں رنجش پیدا ہو گئی۔ مہربانی کر کے ان دونوں میں صلح کرا دیں۔

قیس لیلی

(لاہوری)

(ایڈیشن نمبر)

تیار ہے

چھاپا کھائی

کاغذ اور سب

چیزیں دیکھنے

کے قابل

ہیں قیمت

ایک دو روپیہ

چار آنہ مہر

نمبر دگلدار

مردم شماری میں پنج ذائقوں کے الگ لکھے جانے میں ہندوؤں کا نقصان ہی کیا ہے۔ ان کی تعداد معلوم ہو جائے گی۔ اور اگر انھیں ساتھ لینا چاہتے ہوں تو اپنے ساتھ ملا کے بنا سکتے ہیں۔ پھر اس میں مضائقہ کیا ہے۔ غریب ادنیٰ لوگوں کی ہمدردی کا بیڑہ مشنریوں نے اٹھایا ہے۔ انھیں اس جانب خاص طور پر توجہ کرنی چاہیے۔

اسی بنا پر ہندوستانی کے صفوں پر ایک مسلمان صاحب مولوی عزیز مرزا صاحب کو مسلم لیگ کی معتمدی کے قابل نہیں بناتے۔ کیونکہ مولوی عزیز مرزا صاحب نے ان غریب مظلوموں کی ہمدردی کی ہر اور بغیر ہندوؤں کے ہجوم میں پڑ کے پاوال ہو جانے سے بچانا چاہا ہے۔ ہم ایسے ہندو بھی پیدا یا تصنیف کر سکتے ہیں جو ہندو لیڈروں کی اس خود غرضی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں۔ مگر مسلمان صاحب کی رائے کی وقعت اسی سے کھل گئی کہ انھیں اپنی گرفتاری کے لیے ایک ہندو اخبار ہی میسر آیا۔

نادل غیب دان دھن جوڑی میں تیار ہو گا۔ اور وسط فردری میں جنوری کے پرچہ شائع ہوئے کے بعد خریداران دگلدار کی خدمت میں پہنچائی جاوے گی۔ گاہے چاند سالہ کا۔ ارضی آرڈر کا اور اس نادل کے محصول کا۔ چونکہ اس کا وزن زیادہ ہو گیا ہے لہذا ہمیں محصول کا ایک آنہ بڑھانا پڑا۔ ہم کئی معینہ سے برابر لکھ رہے ہیں کہ جہاں اس کے دسی تی جھینے کی اجازت دی جائے جس میں خریداروں ہی کا فائدہ متصور ہے مگر اس وقت تک ۱۹۱۷ء خریداروں میں سے صرف ایک سو کرم فرماؤں نے اجازت دی ہے۔ اور باقی سب صاحب خاموش ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اہل ہند سے عموماً اور مسلمانوں سے خاصہ یہ بے پروائی اور تغافل شعاری کا مرض کب دُور ہو گا۔ یہ ہم کو یقین ہے کہ سب صاحب راضی ہیں اور دل سے اجازت دیتے ہیں۔ مگر آخر ایک پیسہ کا کارڈ لکھ کے بھیج دینے میں آپ کیا تامل ہے؟ خدا قوم اور ملک میں سعدی اور زہرہ دلی پیدا کرے۔ سچ یہ ہے کہ ہم اسی تغافل کے کشتہ ہیں۔

نادل غیب دان دھن کی جدا کا قیمت ایک روپیہ ہے۔

دل فرور

نادولون کے شائق خصوصاً مولانا خضر کے
 نادولون کے شہید اس رسالے کو خضر خیر فرمائیں
 حسین ہمیشہ دوست نادولون کا سلسلہ جاری
 رہتا ہے۔ مجبوری صاف ٹائٹل کے علاوہ (۳۲)
 ہونے ہیں۔ ہلانا دل مولانا خضر کا طبع زرا دہو
 ہو۔ اور دوسرا انگور کی کے کسی نادول کا ترجمہ
 سالانہ چندہ مع حصول ڈاک جا رہر سال اپریل
 سے دل افروز کا سال شروع ہوتا ہے اور اپریل
 کا پرچہ جا پر روی پی بیج کے سالانہ چندہ
 وصول کر لیا جاتا ہے۔ نمونہ کے واسطے مرنے
 لکھ آنا چاہیے۔

مہذب باب اکہینی

۱۳	رام پیری کامل	۱۳	ننگالی دد ملهن	جوش فغن	۱۳	بالهوس
۱۴	عبرت کامل	۱۴	جنگ حزمین و طعیم	کرشمه تقدیر	۱۴	اشاعر کا انجم
۱۵	حسن سرود کامل	۱۵	نکاری کا پتہ	نشت	۱۵	عقی محمد
۱۶	اختر حسینہ کامل	۱۶	عروس بہ نزن	محبوس کشت	۱۶	عقی محمد
۱۷	گورا	۱۷	بیزان ددست	معتوفہ عرب	۱۷	عقی محمد
۱۸	نیل کا سانپ	۱۸	پری خانہ	رہبر	۱۸	عقی محمد
۱۹	اہرام مصری	۱۹	ہم غریا ہم غواب	سبز باغ	۱۹	عقی محمد
۲۰	تقدیر	۲۰	دفاع نادری	الوکی دم فاختہ	۲۰	عقی محمد
				لال کچان	۲۱	عقی محمد
				خوبی منت	۲۲	عقی محمد

المشترک: محمد صدیق حسن فیروز المظہربیک کاشانی کثرہ ترین برگ خان کفر

تصانیف مولانا محمد عبد حکیم صاحب مدظلہ

(۳۱) ماہ ملک - غریبوں کا مہر اور نذرانہ	(۱) تاریخ و سوانح عمریان
(۳۲) لغت حسین - پہلی صدی ہجری کا تاریخی ناول	(۲) جند قنادی - حضرت عید کے سلسلہ
(۳۳) ایام غریب - جہانگیر کی شہریت کی تاریخ	(۳) ابو جعفر بلخی - حضرت بلخی کے حالات
(۳۴) مقدس نازین - ایک مہینہ کا پتہ	(۴) تاریخ سندھ - عہدِ محمدیہ کی تاریخ
(۳۵) شوقین ملکہ - دوسری صدی ہجری کا ناول	(۵) خواجہ معین الدین - حضرت خواجہ گیسو کی تاریخ
(۳۶) قیس و لبنی - مہر کا ایک سچا عشق	(۶) اسکینہ بنت حسین - جہانگیر کی تاریخ
(۳۷) فلورا فلورینا - انڈس میں سلطنت عرب	(۷) افسانہ قیس - بنو ہاشم کی تاریخ
(۳۸) آغا صادق کی شادی - ایک عجیبہ	(۸) حسن بن صباح - بانی فرقہ اہلناہیہ
(۳۹) فلہانا - عہدِ محمدیہ کا ایک سچا واقعہ	(۹) قرۃ العین - ایک عہدِ محمدیہ کی تاریخ
(۴۰) فردوس بریں - جہانگیر کی تاریخ	(۱۰) شیرین ملکہ - فرخ پور کی تاریخ
(۴۱) یوسف و زلیخا - کامل و نامکمل	(۱۱) ملکہ زلیخا - ملکہ کی ایک عربی ناول
(۴۲) غریبہ مصر - مولانا کا تاریخی ناول	(۱۲) صلیبہ بن اسلام - ایک مختصر تاریخ
متفرقات	
(۴۳) الحاکم الراعیہ - معرفت میں سید احمد نامی کے	(۱۳) جولایہ حق - حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری
(۴۴) ایک لک کے کا ترجمہ	(۱۴) ناول عہد دوم
(۴۵) سرسید کی دینی بحثیں	(۱۵) بابک خرمی - سلطنت عہد کے زمانے کا ایک تاریخی ناول
(۴۶) ہندوستان کی موسیقی	(۱۶) ہر دو حصہ - ایک نیا تاریخی ناول
(۴۷) اور سے ہندوستان کا تعلق	(۱۷) مفتوح فاتح - ایک نیا تاریخی ناول
(۴۸) زمانہ اور اسلام مولانا کا تاریخی ناول	(۱۸) افغانیہ - ایک عہدِ محمدیہ کی تاریخ
(۴۹) شبِ عمر	(۱۹) خوفناک محبت - ہندوستان کی تاریخ
(۵۰) شب و کل - ایک قابل دید ناول	(۲۰) دھات کی سس - اچھی تصویر زمین کی تاریخ
(۵۱) اسیر بنی بابل - ایک قابل دید ناول	(۲۱) حشر کا ڈاکو - حرام پور کے نواب کی تاریخ
(۵۲) متفرق مطبوعات و لکچر	(۲۲) ہر دو حصہ - ایک نیا تاریخی ناول
(۵۳) مسلمانانِ ہندوستان کا تذکرہ	(۲۳) اسرار ہمارے حرم پور - حرم پور کے نواب کی تاریخ
(۵۴) یادداشتیں - ایک نیا تاریخی ناول	(۲۴) حالات - ہر دو حصہ - ایک نیا تاریخی ناول
(۵۵) توہم و کفر کا ترجمہ	(۲۵) غیبی وطن - جنتِ انور کی تاریخ
(۵۶) سہم عہد چہارم عہد پنجم عہد	(۲۶) رشتہ الکبریٰ - آدم پر گاتھ و گون کا حصہ

دنگلہ از کی مکمل جلدین	دنگلہ از کی مکمل جلدین
جلد ۱۰	جلد ۱۰
جلد ۱۱	جلد ۱۱
جلد ۱۲	جلد ۱۲
جلد ۱۳	جلد ۱۳
جلد ۱۴	جلد ۱۴
جلد ۱۵	جلد ۱۵

اشتر حکیم محمد سلج الحق منیجر دنگلہ از شرہ برین بیگ خان لکھنؤ

